ہمدرد نونہال

وقت کے تقاضوں کی تکمیل

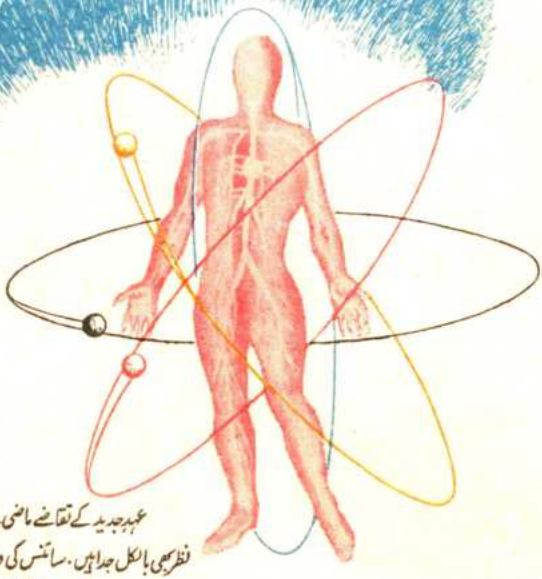

عہدِ جدید کے تقاضے ماضی سے کہیں مختلف ہیں۔ اس عہد کے زاویہ ہائے نظر بھی بالکل جدا ہیں۔ سائنس کی وجہ سے انسانی تصورات میں جو انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں ان کے معاشرتی ردِعمل نے انسان کے لیے گوناگوں مسائل پیدا کر دیے ہیں ہمیں ان مسائل کا حل تلاش کرنا ہے۔

اِن ہی اہم مسائل میں صحت کا مسئلہ بھی ہے جسے **ہمدرد** اس دَور کے تقاضوں کے مطابق ترقی یافتہ سائنسی طریقوں کی مدد سے حل کرنے کے لیے سرگرمِ کار ہے

ہمدرد

ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان

ٹیلے فون: ۶۱۶۰۰۱- (۵ لائنیں)

ہمدرد
نونہال

ربیع الثانی ۱۳۹۷ھ
اپریل ۱۹۷۷ء

مجلس ادارت

حکیم محمد سعید دہلوی — صدرِ مجلس
مسعود احمد برکاتی — مُدیر
حکیم محمد یٰسین دہلوی — مُدیر

جلد ۲۵ - شمارہ - ۴

پتا: ہمدرد نونہال، ہمدرد ڈاک خانہ، ناظم آباد، کراچی ۱۸

قیمت
عام شمارہ: ایک رُپیہ ۷۵ پیسے
سالانہ ۱۸ رُپے

ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن (پاکستان)
نے نونہالوں کی تعلیم و تربیت اور صحت و مسرت کے لیے شائع کیا

اِس شمارے میں کیا ہے؟

جاگو جگاؤ	جناب حکیم محمد سعید	۳
خیال کے پھول	ننھے گل چیں	۴
رنگین ٹی وی (نظم)	جناب محشر بدایونی	۵
جارج ایلیٹ	جناب علی اسد	۶
سائلس مارنر	جارج ایلیٹ، ترجمہ جناب علی اسد	۹
کارٹون	جناب مشتاق	۲۰
ایک ادیب، ایک انسان	جناب رشید الدین احمد	۲۱
اقبال (نظم)	جناب ناصر زیدی	۲۵
ٹِک ٹِک ٹِک ٹِک	جناب میرزا ادیب	۲۷
ڈاکو کا ساتھی	علی الف	۳۳
ہمدرد انسائیکلو پیڈیا	ادارہ	۴۹
اخبار نونہال	ننھے صحافی	۵۳
جلالو خاں اور شاہی جوتے	جناب معراج	۵۵
اِس شمارے کے مشکل الفاظ	ادارہ	۶۰
اولمپک کھیل	جناب شاہ حمید عطا	۶۱
معلوماتِ عامہ، سلسلہ ۱۳۲	جناب عصمت علی پٹیل	۶۶
نونہال مصور	ننھے آرٹسٹ	۶۷
صحت مند نونہال	ادارہ	۷۰
رنگ برنگی پھل چھڑیاں	ننھے مزاح نگار	۷۲
سزا	جناب عبدالرشید غوری	۷۴
نونہال ادیب		۸۱
دل چسپ اور حیرت انگیز		۱۰۰
بزم نونہال		۱۰۱
معلومات عامہ نمبر ۱۳۰ کے جوابات		۱۰۴
حلقۂ دوستی		۱۰۹

جاگو جگاؤ

بعض لوگ بڑے محنتی ہوتے ہیں، ہر کام کو بڑے شوق سے شروع کرتے ہیں، لیکن بہت جلد اس کام سے اُکتا جاتے ہیں اور بَددِل ہوکر دوسرا کام شروع کرتے ہیں، اِس طرح اُن کی محنت رائیگاں چلی جاتی ہے، کیوں کہ کسی کام کو انجام تک نہ پہنچائے بغیر اُس کا فائدہ اور نتیجہ نہیں نکلتا۔ فائدہ حاصل کرنے کے لیے ثابت قدمی ضروری ہے۔ ثابت قدمی کا مطلب یہ ہے کہ جب ایک کام شروع کر دیا جائے تو جب تک وہ پورا نہ ہو جائے اُس کو چھوڑا نہ جائے۔

جو لوگ ثابت قدم یا مستقل مزاج نہیں ہوتے وہ زندگی میں کامیاب نہیں ہوتے اور ان کو محنت کا پھل نہیں ملتا۔ کامیابی کے لیے محنت کے ساتھ ثابت قدمی بھی ضروری ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ کامیابی ہو تو آدمی ثابت قدم رہ سکتا ہے، لیکن وہ یہ نہیں سمجھتے کہ ثابت قدمی ہی سے کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ کِسی کام کو اَدھورا اور نامکمل چھوڑ دینے کے معنی ہیں ناکامی اور کام مکمل کرنے کے معنی ہیں کامیابی۔

تمھارا دوست اور ہمدرد

حکیم محمد سعید

خیال کے پھول

★ علم ایک ایسا پھول ہے جو جتنا زیادہ کھلتا ہے اتنی ہی زیادہ خوش بُو دیتا ہے (حضرت لقمانؑ)

مرسلہ: محمد طارق بزمی، سیالکوٹ

★ جب کسی قوم کی بربادی خدا کو منظور ہوتی ہے تو وہ اُن پر جھگڑے اور فساد کے دروازے کھول دیتا ہے (امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ)

مرسلہ: فریدہ چودھری، کوٹ اَدّو

★ ایمان دار تاجر کا مرتبہ عابد کے مرتبے کے برابر ہے۔

(امام شافعیؒ)

مرسلہ (نصیر الدین، کراچی)

★ مطالعہ غم اور اُداسی کا بہترین علاج ہے۔

(شیخ سعدیؒ)

مرسلہ: طلعت عزیز، کراچی

★ جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اس کی زندگی اطمینان سے گزرے، وہ اپنے دل میں لالچ کو جگہ نہ دے۔

(داتا گنج بخشؒ)

مرسلہ: آئنہ شگفتہ فرحت، کراچی۔

★ تحریر ایک خاموش آواز ہے اور قلم ہاتھ کی زبان۔ (سقراط)

مرسلہ: محمد رفیق، کراچی

★ اگر مومن کو فائدہ نہ پہنچا سکو تو نقصان بھی نہ پہنچاؤ۔ اگر خوش نہ کر سکو تو ناراض بھی نہ کرو۔ اگر اس کی تعریف نہ کر سکو تو بُرائی بھی نہ کرو (شاذلیؒ)

مرسلہ، اعجاز حیدر رضوی، کراچی

★ سورج کی روشنی میں کائنات کے بلند و پست نظر آتے ہیں اور علم کی روشنی میں زندگی کے بلند و پست (عمر خیام)

مرسلہ: نجمہ انصاری، کراچی

★ میں آپ کو مصروفِ عمل ہونے کی تاکید کرتا ہوں۔ کام، کام اور بس کام۔ سکونِ خاطر، صبر و برداشت کے ساتھ اپنی قوم کی سچی خدمت کرتے رہیے۔

(قائد اعظمؒ)

مرسلہ: نزہت رضوی، حیدر آباد

★ ہم نے پاکستان کا مطالبہ زمین کا ٹکڑا حاصل کرنے کے لیے نہیں کیا تھا، بلکہ ہم ایک ایسی تجربہ گاہ حاصل کرنا چاہتے تھے جہاں ہم اسلام کے اصولوں کو آزما سکیں۔

(قائدِ اعظمؒ)

مرسلہ: حیدر علی بلوچ، پسنی، مکران

★ میدانِ جنگ میں میرا سب سے بڑا ہتھیار ذاتی استقلال ہے۔ (نپولین)

مرسلہ: طارق احمد بٹ، کراچی

رنگین ٹی وی

محشر بدایونی

رنگین ٹی وی آیا
گھر میں بہار لایا
تصویر دِل نشیں ہے
آواز بھی حسیں ہے
اُردو کی ایک پکچر
دِکھلا رہی ہے منظر
بادل سفید گالے
اُونچے پہاڑ کالے
پتّوں کا رنگ دَھانی
پھولوں کا ارغوانی
سب رنگ خواب جیسے
چہرے گلاب جیسے
نیلا ہے سُوٹ کوئی
کالا ہے بُوٹ کوئی

آراستہ سا گھر ہے
سامان مختصر ہے
صوفوں کا رنگ نیلا
پردوں کا رنگ پیلا
فن کار کوئی آیا
پیارا سا گیت گایا
اَمّی بھی دوڑی آئیں
دادی کو ساتھ لائیں
دادی نے آنکھیں پھاڑیں
ٹی وی پہ نظریں گاڑیں
کہنے لگیں کہ بیٹی
عاجز ہے عقل میری
صندوق بولتا ہے
جادو نہیں تو کیا ہے

جارج ایلیٹ

سائلس مارنر کی مُصنّفہ کی کہانی

ناول "سائلس مارنر" کی مُصنفہ کا اصلی نام میری این ایوَنس — (MARY ANN EVANS) تھا۔ مگر وہ جارج ایلیٹ (GEORGE ELIOT) کے مَردانہ قلمی نام سے لکھا کرتی تھیں۔ وہ وارِوِک شائر (WARWICKSHIRE) کے مقام کولٹن کے آربری فارم میں ۱۸۱۹ء میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد کا نام تھا رابرٹ ایونس — (ROBERT EVANS)۔ وہ زمینوں کی خرید و فروخت کا کام کیا کرتے تھے۔ میری کی پیدائش کے چند ماہ بعد اُن کا خاندان گرف منتقل ہوگیا جہاں میری پانچ سال کی عمر تک رہیں۔ اس کے بعد وہ اٹیل بورو کے اسکول میں داخل ہوگئیں۔ چار سال بعد وہ نیونی ٹن کے بورڈنگ اسکول میں چلی گئیں جہاں وہ اپنے اُستادوں میں بہت مقبول ہوئیں۔ اس اسکول کی پرنسپل مِس لوئیس (MISS LEWIS) سے ان کے مخلصانہ تعلقات آخر وقت تک قایم رہے۔ شاید اسی وجہ سے انھیں عورتوں کی اعلا تعلیم سے بڑی دل چسپی رہی۔

۱۸۳۶ء میں ان کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔ لہٰذا وہ سترا (۱۷) برس کی عمر میں اپنے والد کے گھر کی دیکھ بھال کرنے کے لیے واپس آگئیں، لیکن اس کے باجود انھوں نے اپنی تعلیم جاری رکھی۔ موسیقی سے اُنھیں بڑی مسرت حاصِل ہوتی تھی۔ اسی کے ساتھ ساتھ اُنھیں مختلف زبانوں سے بھی کافی دِل چسپی تھی، چناں چہ انھیں جرمن اور اطالوی زبانیں سکھانے کے لیے کاونٹری (COVENTRY) سے اُستاد آتے تھے، انھوں نے اُن دونوں زبانوں پر خوب عبور حاصل کرلیا۔

جب ۱۸۴۱ء میں اُن کے والد کا وِنٹری کے قریب فولس ہِل (FOLESHILL)

منتقل ہو گئے تو وہاں میری کی ملاقات چارلس برے (CHARLES BRAY) سے ہوئی جو فلسفیانہ مضامین لکھتے تھے۔ برے کے ساتھ ان کے برادرِ نسبتی چارلس ہینل (CHARLES HENNEL) سے بھی ملاقات ہوئی۔ یہ دونوں ادیب میری کے دلی دوست بن گئے۔ اسی دوران میری نے کئی فلسفیانہ اور مذہبی کتابوں کا جرمن اور اطالوی زبانوں سے ترجمہ کیا۔

اس کے بعد ۱۸۵۱ء میں "ویسٹ منسٹر ریویو" (WEST MINSTER REVIEW) کی نائب مدیر ہو گئیں جبکہ ۱۸۴۹ء میں ان کے والد کا انتقال ہو چکا تھا اور وہ دونوں ادیبوں برے اور ہینل کے ساتھ غیر ملکوں کی سیاحت کر چکی تھیں۔ ویسٹ منسٹر ریویو میں ان کے جو مضامین شائع ہوتے تھے ان پر وہ اپنا نام میرین ایونس (MARIAN EVANS) لکھتی تھیں، مگر جب انھوں نے لکھنا شروع کیا تو اپنا نام جارج ایلیٹ (GEORGE ELIOT) لکھنے لگیں۔ اسی سال بلیک ووڈس میگزین (BLACKWOOD'S MAGAZINE) میں ان کی لکھی ہوئی کہانیوں کا ایک سلسلہ شروع ہوا۔ ادبی حلقوں میں اس سلسلے کی بنا پر کافی ہل چل مچی۔

۱۸۵۹ء میں انھوں نے اپنا پہلا ناول آڈم بیڈ (ADAM BEDE) لکھا جو بہت مقبول ہوا اور خوب فروخت ہوا۔ اِس میں آڈم بیڈ کے کردار میں جو خوبیاں دکھائی گئی ہیں وہ سب میری ایونس نے اپنے والد میں دیکھی تھیں۔ دوسرے سال دوسرا ناول، دی مِل آن دی فلاس (THE MILL ON THE FLOSS) شائع ہوا۔

سائلس مارنر کا تعلق ۱۸۶۱ء سے ہے اور شاید یہ ان کی سب سے خوب صورت کتاب ہے۔ میری ایونس کی ادبی زندگی کا پہلا دَور اس کتاب پر ختم ہوتا ہے۔ ان کے درمیانی دَور کی سب سے مشہور کتاب "رمولا" (RAMOLA) ہے۔ اس میں اطالوی زندگی کی عکاسی کی گئی ہے۔ اس کے بعد انھوں نے شاعری میں بھی طبع آزمائی کی۔ ان کی نظم کی کتاب کا نام "ہسپانوی خانہ بدوش" اسپینش جپسی (THE SPANISH GYPSY) ہے، لیکن جارج ایلیٹ کی شہرت ایک شاعر کی حیثیت سے قطعی نہیں ہے، ان کو ایک ناول نویس کی حیثیت سے ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔

۱۸۷۲ء میں انھوں نے انگلستان کی زندگی کے بارے میں ایک ناول لکھا جس کا نام "مڈل مارچ" (MIDDLE MARCH) ہے۔ ۱۸۷۶ء میں ایک اور ناول "ڈینیل ڈیرونڈا" (DANIEL DERONDA) شائع ہوا۔ یہ ان کا آخری ناول ہے۔ مئی ۱۸۸۰ء میں انھوں نے مسٹر جان کراس سے شادی کی مگر چند ہی مہینے بعد ۲۲ دسمبر ۱۸۸۰ء کو ان کا انتقال ہوگیا۔

سائلس مارنر ان کے ابتدائی دور کا ناول تھا۔ ایک نثر نگار کی حیثیت سے انھیں اسکاٹ (SCOTT) تھیکرے (THACKERAY) اور ڈکنیس (DICKENS) کے ہم پلہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

ریوریو کے جُلاہے کی یہ داستان بذاتِ خود ایک نہایت خوب صورت تانا بانا ہے۔ بوڑھے جولاہے کا کردار جس طرح پیش کیا گیا ہے وہ قطعی ایک شاہ کار ہے۔ اس کی زندگی بھر کی کمائی ہوئی دولت لٹ جاتی ہے اور یہ دولت اسے ایک بچی کی شکل میں مل جاتی ہے جس سے اس بوڑھے کی یکہ و تنہا زندگی کی کایا پلٹ ہو جاتی ہے یہی بوڑھا اُس ناول کا ہیرو ہے۔ اس بوڑھے کی داستان میں ایک دل کش حزن و ملال ہے جس کے دل میں ایک پرائی بچی کی محبت اُجاگر ہوگئی۔ جو لوگ نسیمِ سحر سے لطف اندوز ہوتے ہیں وہ اس ناول کی قدر کریں گے، لیکن جو لوگ طوفان کی تلاش میں ہیں اُن کو شاید اس کے مطالعے میں لطف نہ آئے۔

آئندہ صفحات میں اس ناول کا خلاصہ پیش کیا جا رہا ہے۔

شیخ سعدیؒ لکھتے ہیں کہ ایک روز وہ حمام میں نہانے گئے تو وہاں اُن کے ہاتھ خوش بودار مٹی (گِلِ حمام) لگی۔ انھوں نے مٹی سے پوچھا کہ "تجھ میں یہ خوش بُو کہاں سے آئی؟" مٹی (گِلِ حمام) نے جواب دیا "میں پھولوں کی صحبت (صحبتِ گُل) میں رہی، اُن کی خوش بُو مجھ میں سما گئی اسی لیے اب مجھ سے بھی مُشک و عبیر کی سی خوش بُو آتی ہے۔ حالاں کہ میں وہی معمولی سی مٹی ہوں۔" اچھوں کی صحبت اچھا اور بُروں کی سنگت بُرا بنا دیتی ہے۔

مشک ایک خاص قسم کے ہرن کی ناف سے نکلتا ہے اور عبیر ایک قسم کا خوش بُودار پاؤڈر ہوتا ہے۔

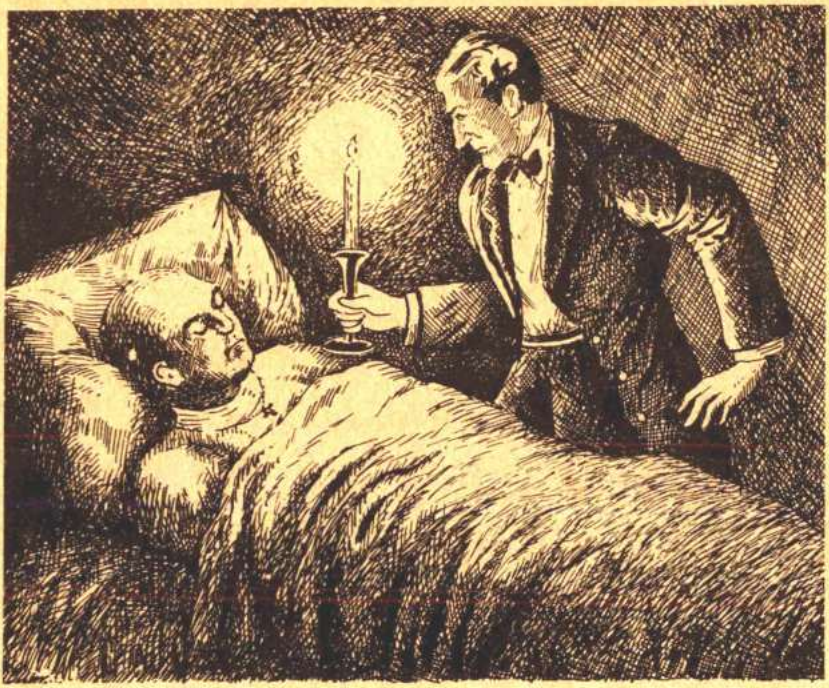

کہانی: جارج ایلیٹ

ترجمہ: علی اسد

سائلس مارنر

انیسویں صدی کے ابتدائی دَور میں انگلستان کے ایک چھوٹے سے شہر ریویلو میں ایک جولاہا رہا کرتا تھا۔ اس کا نام تھا سائلس مارنر۔ اس شخص کے نہ تو بال بچے تھے اور نہ کوئی دوست احباب۔ عام طور پر لوگ اُس سے خوف زدہ رہتے اور نہایت حقارت کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ ڈرتے اس لیے تھے کہ اسے ایسی بیماری تھی جس کی وجہ سے اس پر اکثر بے ہوشی کے دورے پڑتے رہتے تھے اور حقارت کا سبب یہ تھا کہ وہ بے حد کنجوس واقع ہوا تھا۔

ریویلو آنے سے پہلے سائلس مارنر ایک باعزت نوجوان تھا۔ وہ لینٹرن یارڈ کے دُور افتادہ شہر میں رہتا تھا۔ اور کپڑا بُننے کا کام کرتا تھا۔ مارنر ہر اتوار کو اپنی منگیتر سارہ کے ہمراہ گرجا جایا کرتا تھا۔ ایک دن یہ دونوں گرجا جا رہے تھے کہ اتنے میں سارہ نے کہا "دیکھو سائلس، ولیم ڈین بھی آ رہا ہے۔ کہو تو اسے بھی ہم اپنے ساتھ لے لیں"۔ اس پر سائلس نے کہا،

"ہاں ہاں، ولیم تو میرا بہترین دوست ہے۔ وہ ہر وقت ہمارے ساتھ شریک ہو سکتا ہے"۔ اتنے میں ولیم قریب آ چکا تھا۔ ان دونوں کو دیکھتے ہی اس نے بڑے طنز سے کہا "اخاہ! محبت کے پرستار چلے آ رہے ہیں"۔

سائلس مارنر نے سنجیدگی سے جواب دیا "آؤ ولیم، ہم سب گرجا چلیں"۔

چناں چہ ولیم ڈین اُن کے ساتھ ہو لیا، مگر جب گرجا میں عبادت ہونے لگی تو اُس نے سارہ کے کان میں چپکے سے کہا "سارہ، تمھارا حُسن تو روز بروز بڑھتا ہی جا رہا ہے"۔ اتنے میں سائلس مارنر پر اچانک دورہ پڑ گیا اور وہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑا۔ سارہ گھبرا کر بولی "جلدی سے ڈاکٹر کو بلواؤ"۔ اس پر ولیم نے کہا "گھبراؤ نہیں، ان پر تو اس طرح کے اعصابی دورے پڑتے ہی رہتے ہیں۔ تھوڑی دیر میں ٹھیک ہو جائیں گے۔ میرا خیال ہے کہ ان کے جسم میں کوئی خراب رُوح چھُپی ہوئی ہے"۔

تھوڑی دیر بعد سائلس ٹھیک تو ہو گیا مگر اپنے مرض اور ولیم ڈین کے حقارت آمیز کلمات کی بدولت سارہ اس سے دن بدن کھنچتی چلی گئی اور اسی کے ساتھ ساتھ ولیم ڈین سے سارہ کی دوستی بڑھتی چلی گئی۔ اسی زمانے میں گرجا کے سب سے بڑے پادری صاحب سخت بیمار ہو گئے۔ ڈاکٹر نے مشورہ دیا کہ دن رات ان کی دیکھ بھال کی جائے۔ چناں چہ یہ طے ہوا کہ رات دو بجے تک سائلس مارنر ان کے پاس رہے اور اس کے بعد ولیم ڈین۔

سائلس مارنر کئی گھنٹے تک بیمار پادری کے پلنگ کے پاس بیٹھا رہا۔ اتنے میں اچانک مارنر کا سارا جسم اکڑ گیا اور اس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ کئی گھنٹے بعد جب ہوش آیا تو اس نے دیکھا کہ گھڑی میں چار بج چکے ہیں۔ سائلس مارنر بہت پریشان

ہو گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ ضرور میں سو گیا ہوں گا۔ اب جو اس نے شمع اٹھا کر پادری کے چہرے کو دیکھا تو پادری کو مُردہ پایا۔ مارنر نے فوراً دوسرے پادریوں کو اطلاع کی اور جب سب لوگ آ گئے تو مارنر بولا "میں شاید چار گھنٹے تک سوتا رہا۔ بہر حال جب میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ یہ مر چکے ہیں۔" یہ سُن کر ایک پادری بولا "سائلس، تم اپنے گھر جاؤ۔ میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔"

اپنے گھر جاتے ہوئے راستے میں سائلس مارنر سوچنے لگا کہ ولیم ڈین حسبِ وعدہ دو بجے رات کو آخر آیا کیوں نہیں۔ کچھ دیر بعد مارنر اپنے گھر میں بیٹھا ہوا تھا کہ دو آدمی اُس کے پاس پہنچ گئے۔ ان میں سے ایک شخص ولیم ڈین تھا اور دوسرا گرجا کا ایک پادری۔

ولیم کو دیکھ کر سائلس بولا "کیوں ولیم تم کہاں.....؟"

مگر اُس کی بات کاٹ کر پادری بول اٹھا "سائلس، ہم لوگ تم کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آئے ہیں تاکہ تم کو گرجا کے ممبروں کے سامنے پیش کیا جا سکے۔" اس پر سائلس نے حیرت سے پوچھا "آخر یہ کس واسطے؟"

پادری بولا "یہ تم کو بعد میں معلوم ہو گا۔"

سائلس مارنر جب گرجا گھر پہنچا تو وہاں تمام لوگ جمع تھے۔ پادری نے سائلس مارنر کو ایک چاقو دکھاتے ہوئے پوچھا "کیا یہ چاقو تمھارا ہے؟"

سائلس نے کہا "ہاں، مگر ان سب باتوں سے تمھارا مطلب کیا ہے؟"

پادری نے کہا "بات یہ ہے کہ یہ چاقو اُس الماری میں پایا گیا ہے جو مرحوم پادری کے پلنگ کے قریب رکھی ہے اور یہ عین اُسی جگہ پر ملا ہے جہاں سے گرجا کا رُپیہ چوری ہوا ہے۔"

اب تو سائلس بے حد پریشان ہو گیا۔ اس نے پوچھا "مگر آپ کو تو یقین نہیں کہ اِس واقعے سے میرا کوئی تعلق ہو گا؟"

پادری نے کہا "مارنر، تمھارے خلاف جو شہادت ہے وہ نہایت قوی ہے۔ ولیم ڈین نے بتایا ہے کہ وہ خود اچانک بیمار ہو گیا تھا اس وجہ سے وعدے کے مطابق رات

دو بجے نہ آسکا۔ علاوہ ازیں تم نے مردے کی طرف سے بھی انتہائی بے پروائی برتی۔"

یہ سُن کر سائلس مارنر رنجیدہ ہوگیا اور بولا "خدا گواہ ہے کہ اس چوری سے میرا قطعی کوئی واسطہ نہیں۔ آپ لوگ میری بات پر اعتبار کریں اور اگر چاہیں تو میرے گھر کی تلاشی بھی لے لیں۔ آپ کو وہاں صرف تین پاؤنڈ اور پانچ شلنگ ملیں گے جو میں نے اپنی آمدنی میں سے پس انداز کرکے رکھ چھوڑے ہیں۔"

مارنر کے مکان کی تلاشی شروع ہوگئی۔ تھوڑی ہی دیر میں ولیم ڈین نے رُپوں کی ایک تھیلی نکال کر سب کو دکھائی اور بولا "یہ دیکھیے! یہ تھیلی اس الماری کی دراز میں سے ملی ہے۔"

سائلس مارنر فوراً ولیم ڈین کی طرف لپکا اور نہایت خوشامدانہ لہجے میں بولا، "تم تو جانتے ہو ولیم کہ میں اس رُپے کو ہرگز نہیں چھُپا سکتا۔ تم مجھ کو نو سال سے جانتے ہو تم شاہد ہو کہ میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔"

اتنے میں پادری بولا "مارنر، تم صبح گرجا کے ممبروں کی مجلس میں شریک ہوگے اور وہی یہ فیصلہ کریں گے کہ آیا تم مجرم ہو یا بے گناہ۔"

یہ سُن کر مارنر نڈھال ہوگیا۔ وہ ایک کُرسی پر بیٹھ گیا اور بولا "میری عقل کام نہیں کرتی۔ اب تو خدا ہی مجھے اس الزام سے نجات دلا سکتا ہے۔"

دوسرے دن گرجا میں سب لوگ جمع ہوئے اور مقدمہ پیش ہوا۔

پادری نے کہا "آپ لوگوں نے سائلس مارنر کے خلاف جو الزام ہے وہ سُن لیا۔ اب آپ قرعہ اندازی کرکے مُلزم کے بارے میں فیصلہ کیجیے۔" کچھ دیر بعد پادری نے قرعہ اندازی کی تمام پرچیاں اکٹھی کیں اور گنتی کرنے کے بعد کہا "آپ لوگوں کے فیصلے کے مطابق سائلس مارنر پر گرجا کا رُپیہ چُرانے کا جرم عائد ہوتا ہے۔" یہ سُن کر سائلس مارنر سے نہ رہا گیا۔ وہ ولیم ڈین کی طرف گھوم پڑا اور بولا "ولیم، تم ہی وہ شخص ہو جس نے آخری بار میرا اچاقو دیکھا۔ لہٰذا تم ہی نے رُپیہ چُرایا ہے اور مجھے پھنسانے کے لیے یہ تمام جال پھیلایا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ خدا بھی منصف نہیں رہا۔ وہ بھی جھوٹوں کے ساتھ ہے اور بے گناہوں کے خلاف ہے۔"

کفر کے یہ کلمات سُن کر ہر شخص حیران رہ گیا۔ ولیم ڈین نہایت معصوم شکل بنا کر بولا "حضرات، اب آپ لوگ خود ہی فیصلہ کر سکتے ہیں کہ یہ آواز سوائے شیطان کے اور کسی کی نہیں ہو سکتی۔ سائلس، میں تمھارے لیے صرف دعا کر سکتا ہوں۔" اس کے بعد سائلس کو اس وقت تک کے لیے گرجا سے خارج کر دیا گیا جب تک کہ وہ اپنے جُرم کا اقبال نہ کرے۔

اپنے بہترین دوست کی دغا بازی پر سائلس بے حد غم زدہ ہو گیا۔ اسی دوران سارہ نے سائلس مارنر سے تعلقات ختم کر ڈالے اور ولیم ڈین سے شادی کر لی۔ ان تمام واقعات کی بدولت مارنر کا دل ٹوٹ گیا اور اسے ہر ایک سے نفرت ہو گئی۔ چناں چہ اس نے لینٹرن یارڈ کو خیر باد کہہ دیا اور ریویلو جیسی دور دراز جگہ آ کر سکونت اختیار کر لی۔

سائلس مارنر کو لینٹرن یارڈ چھوڑے ہوئے اب پندرہ برس ہو چکے تھے۔ ریویلو میں اسے سوائے اپنے کام کے اور کسی چیز سے کوئی غرض نہ تھی۔ چناں چہ اس عرصے میں اس نے کافی رُپیہ جمع کر لیا۔ وہ روزانہ اپنی دولت کو گنتا اور چمکتے ہوئے سکوں کی جھنکار سے اپنے دل کو خوش کرتا رہتا تھا۔ ایک دن اسے خیال آیا کہ اس دولت کو کہیں چھپا دینا چاہیے تاکہ کوئی چور اُچکا اسے چُرا نہ لے جائے۔ چناں چہ اس نے فرش کھود کر چند اینٹیں اُکھاڑیں اور اس کے نیچے اپنی دولت کو دفن کر دیا۔ جب یہ کام کر لیا تو وہ اطمینان سے ایک گاہک کے لیے کپڑا لے کر گھر سے نکل گیا تاکہ اس کی اُجرت بھی وصول ہو جائے اور دولت میں بھی ایک چمکتی ہوئی اشرفی کا اور اضافہ ہو جائے۔

اسی سال بڑے دن کے زمانے میں سائلس مارنر کی زندگی میں ایک اور زبردست انقلاب آ گیا اور اس کی زندگی نہایت انوکھے انداز میں اپنے پڑوسیوں کی زندگی سے وابستہ ہو گئی۔

ریویلو میں سُرخ محل نامی ایک عالی شان مکان تھا جس میں ایک رئیس رہا کرتے تھے۔ ان کا نام تھا کیس۔ یہ اپنے چار بیٹوں کے ساتھ رہتے تھے۔ بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ ایک روز اُن کا بڑا بیٹا گاڈفری اپنے نکمّے بھائی ڈینسٹن کے انتظار میں نہایت بے چینی سے ٹہل رہا تھا کہ اتنے میں وہ آ گیا اور آتے ہی طنزاً بولا "گاڈفری، تم تو میرے بڑے بھائی ہو اس لیے تمھارے بلانے پر مجھے آنا ہی پڑتا ہے۔"

گاڈفری نے کہا "اچھا، اچھا، اب اس لعن طعن کو چھوڑو اور سنجیدگی سے سنو! مجھے تم سے

اس رُپے کے بارے میں کہنا ہے جو میں نے وصول کر کے تم کو دے دیا تھا۔ والد صاحب کو رپے کی شدید ضرورت ہے۔ جلد از جلد رُپے کا بندوبست کرو۔"

ڈینسٹن نہایت ترش رو ہو کر بولا، "تم خود بندوبست کیوں نہیں کرتے۔ تم نے تو بڑے بھائی کی حیثیت سے وہ رُپیہ مجھے دیا تھا اب تم ہی اس کا بندوبست بھی کرو۔" یہ کہہ کر ڈنسٹن مُنھ چڑھاتا ہوا اپنے بڑے بھائی کے قریب آیا۔

گاڈفری نے کہا، "میرے قریب مت آؤ ورنہ ایسا ہاتھ ماروں گا کہ یاد کرو گے۔"

یہ سُن کر ڈینسٹن ذرا پیچھے کھسکا اور بولا، "ارے نہیں نہیں، جس وقت تک میں تمھاری اور اس نیک بخت عورت مولی فیرن کی شادی کے راز کو اپنے سینے میں چُھپائے ہوئے ہوں اس وقت تک تم مجھے کیا مارو گے!"

گاڈفری گھبرا کر بولا، "دیکھو والد صاحب کو اگر تم نے یہ بتا دیا تو تمھارے لیے اچھا نہ ہوگا۔" اب تو ڈینسٹن کی چڑھی بار گاہ تھی، کہنے لگا، "گھبراؤ نہیں، میں ایک ایسی ترکیب بتاتا ہوں جس سے والد صاحب کی نظروں میں تم حقیر بھی نہ ہو گے اور مس نینسی لیمیٹر کے سامنے بھی سُرخ رُو رہو گے۔"

گاڈفری تیزی سے بولا، "دیکھو مس نینسی کا نام نہ لو۔ اچھا یہ بتاؤ ترکیب کیا ہے؟"

ڈینسٹن بولا، "ترکیب نہایت آسان ہے۔ وہ یہ کہ مجھے تم اپنا گھوڑا وائلڈ دے دو میں اسے شکار گاہ لے جا کر فروخت کر ڈالوں گا۔ کم از کم ۱۲۰ پونڈ تو مل ہی جائیں گے۔"

بادلِ ناخواستہ گاڈفری اس پر راضی ہو گیا اور ڈینسٹن گھوڑا لے کر روانہ ہونے لگا۔ چلتے وقت گاڈفری نے کہا،

"دیکھو ڈینسٹن، شراب نہ پینا ورنہ تم گھوڑے پر سے گر کر مر جاؤ گے۔"

ڈینسٹن گھوڑے پر سوار ہو کر بولا، "بھائی جان، سچ تو یہ ہے کہ تم کو میری جان کی اتنی فکر نہیں جتنی کہ اپنے چہیتے گھوڑے کی ہے۔"

گاڈفری نہایت رنجیدہ ہو کر سوچنے لگا کہ مجھے یہ امید نہ تھی کہ ایک دن اپنے بہترین گھوڑے سے بھی ہاتھ دھونا پڑیں گے۔

قصہ مختصر جب ڈینسٹن شکار گاہ پہنچا تو میجر برائس نے اسے آواز دی اور کہا،

"کہو ڈینسٹن، آج تو تم اپنے بھائی کے گھوڑے پر سوار ہو" اس پر ڈینسٹن نے کہا، "ہاں میں نے یہ ان سے لے لیا ہے۔ اب یہ گھوڑا میرا ہے۔ بڑا عمدہ گھوڑا ہے۔ کل مجھے اس کے ڈیڑھ سو پونڈ مل رہے تھے، مگر میں نے انکار کر دیا۔"

برائس نے کہا "مگر میں تو اس کے تمہیں ایک سو بیس سے زیادہ نہیں دے سکتا۔"

کچھ دیر بعد سودا طے ہو گیا۔ برائس نے کہا "تم گھوڑے کو بیدرلی پہنچا دو اور وہاں رُپیہ لے لو۔ لیکن یہ خیال رکھنا کہ گھوڑا صحیح سلامت پہنچے ورنہ سودا ختم ہو جائے گا۔"

ڈینسٹن کچھ دیر تک شکارگاہ میں ٹھہرا رہا اور شکار میں شریک ہونے والوں کو دیکھتا رہا۔ اتنے میں یکایک اس کے دل میں خیال آیا کہ چلو میں بھی شکار کا لطف اٹھا لوں، شاید کوئی انعام ہی مل جائے۔ چناں چہ ڈینسٹن بھی اور لوگوں کے ہمراہ شکار میں شریک ہو گیا۔ کچھ لوگوں نے اس کے گھوڑے کی تعریف بھی کی۔ اس سے ڈینسٹن کو اور بھی یقین ہو گیا کہ ضرور گھوڑ دوڑ میں اسے انعام مل جائے گا۔ مگر چوں کہ ڈینسٹن کو اچھی طرح گھوڑا دوڑانا نہ آتا تھا، اس لیے وہ سب سے پیچھے رہ گیا۔ اتنے میں راستے میں نوکیلی لکڑیوں کا ایک جنگلا آ گیا۔ ڈینسٹن نے چاہا کہ گھوڑا اس کے اوپر سے پھاند جائے۔ مگر چھلانگ لگاتے وقت گھوڑے کی ٹانگ لکڑی کے جنگلے میں پھنس گئی۔ ڈینسٹن تو قلابازی کھا کر دُور جا گرا، لیکن گھوڑے کے پیٹ میں جنگلے کی ایک نوکیلی لکڑی بُری طرح سے دھنس گئی۔ ڈینسٹن لڑکھڑاتا ہوا اٹھا اور گھوڑے کے قریب آیا۔ اب جو دیکھتا ہے تو گھوڑا مر پڑا ہے۔ ڈینسٹن اس حادثے سے بڑا پریشان ہو گیا۔ چاروں طرف کُہر چھایا ہوا تھا۔ وہ گاڈفری کا کوڑا ہاتھ میں لیے اندازے سے آگے بڑھنے لگا۔ کچھ دور جا کر اُسے روشنی نظر آئی۔ وہ سوچنے لگا کہ ہو نہ ہو یہ سائلس مارنر کا مکان ہے۔ اس خیال کے آتے ہی وہ سوچنے لگا کہ اس کنجوس سائلس مارنر کے پاس تو بہت دولت ہے۔ کیوں نہ اس سے قرض مانگ لوں۔ وعدہ کر لوں گا کہ تجھے سُود بھی دوں گا۔

چناں چہ یہ سوچتا ہوا وہ مارنر کے مکان تک پہنچ گیا۔ پہلے اس نے دروازے پر دستک دی، مگر جب جواب نہ ملا تو وہ اندر داخل ہو گیا۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر گھومنے کے بعد اس کی نظریں فرش پر پڑیں جہاں کی اینٹیں حال ہی میں ہٹائی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ چناں چہ اُس نے

تیزی سے اس جگہ کی اینٹیں ہٹانا شروع کر دیں اور تھوڑی ہی دیر میں مارنر کی دولت اس کے ہتھے چڑھ گئی۔ لہٰذا وہ اسے لے کر فوراً نو دو گیارہ ہو گیا۔

ڈینسٹن ابھی تھوڑی ہی دُور گیا ہو گا کہ مارنر اپنے گھر واپس آ گیا، مگر جوں ہی وہ اندر داخل ہوا اسے فرش کی اینٹیں اُکھڑی ہوئی نظر آئیں۔ مارنر بوکھلا گیا۔ وہ چیخ اُٹھا۔ "ہائے میرا خزانہ! میری زندگی بھر کی کمائی لٹ گئی۔ کچھ دیر بعد مارنر سوچنے لگا کہ شاید میں نے اپنی دولت کسی اور جگہ چھپا دی ہے اور بھول گیا ہوں

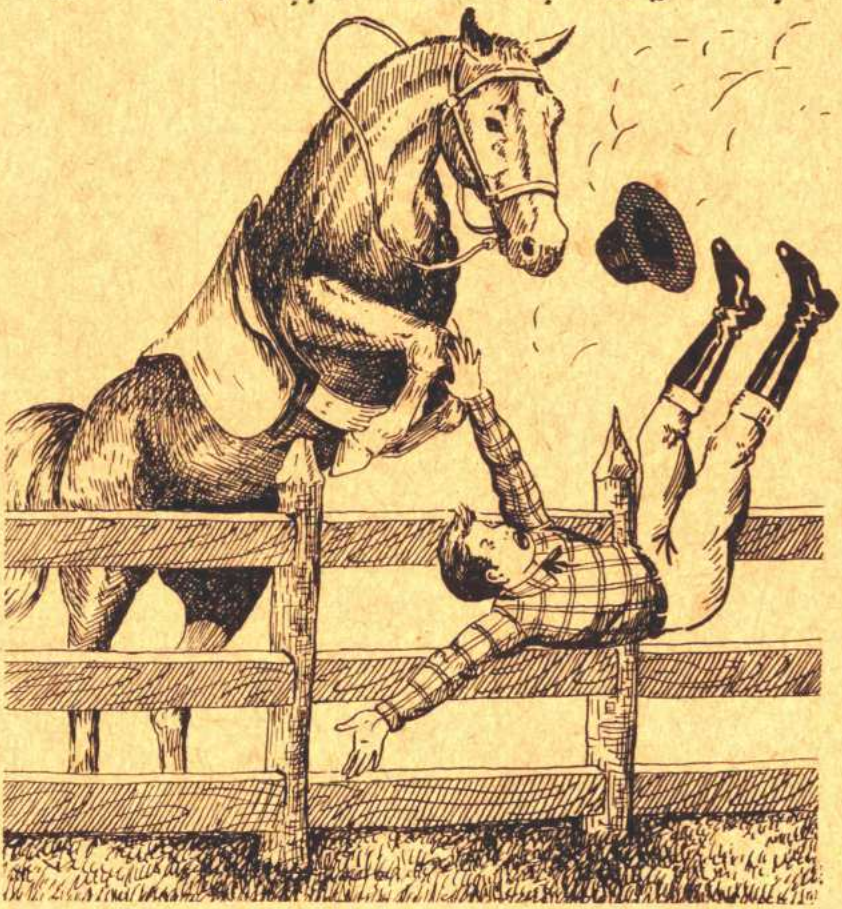

چناں چہ وہ گھر کا ایک ایک کونا دیکھنے لگا۔ اور جب کہیں کچھ نہ ملا تو وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ یکایک اسے جم راڈنی کا خیال آیا جو چوری کے سلسلے میں بدنام تھا۔ پھر اُسے یہ بھی یاد آیا کہ ایک بار جم راڈنی نے اس کی دولت کے بارے میں مذاق بھی کیا تھا۔ یہ خیال آتے ہی مارنر کو یقین آ گیا کہ بس جم راڈنی ہی چور ہے۔ چناں چہ وہ سیدھا شراب خانے کی طرف چل دیا جہاں تمام لوگ جمع ہوا کرتے تھے۔

مارنر کو دیکھتے ہی لوگوں نے اس سے پوچھا کہ کیا معاملہ ہے؟ مارنر بولا "میں لُٹ گیا۔ میں انصاف کا طالب ہوں۔ کہاں ہیں رئیس کیس — اور سپاہی وغیرہ؟"

جم راڈنی بھی وہیں بیٹھا ہوا تھا۔ شراب خانے کے مالک نے اس سے کہا "اسے سنبھالو۔ اس کا تو شاید دماغ چل گیا ہے۔" اس پر جم بولا "تم خود ہی سنبھالو، میری بلا سے اس کے یہاں چوری ہوئی ہو یا قتل۔"

جم راڈنی کو دیکھتے ہی مارنر چلّایا "راڈنی!"

جم راڈنی نے گھبرا کر کہا "کیا بات ہے مارنر صاحب؟"

مارنر بولا "تم نے میرا رُپیہ چُرا لیا ہے۔ مجھے واپس دے دو تو پھر میں سپاہی سے نہ کہوں گا، جم میں تم کو ایک اشرفی بھی دوں گا۔"

یہ سُن کر جم راڈنی نہایت غصّے سے بولا "میں نے تمھارا رُپیہ چُرایا؟ اگر آئندہ ایسی بات منھ سے نکالی تو اسی شراب کے ڈونگے سے میں تمھاری آنکھ پھوڑ دوں گا۔" اس پر شراب خانے کے مالک نے بیچ بچاؤ کرایا اور گواہی دی کہ جم راڈنی بہت دیر سے شراب خانے میں بیٹھا ہوا ہے، لہٰذا وہ بے قصور ہے۔ یہ سُن کر مارنر نے جم راڈنی سے معافی مانگی اور تمام لوگوں سے اپنی مصیبت بیان کی۔ اس کے بعد گاؤں کے لوہار نے پوچھا "مارنر تمھاری تھیلی میں کتنا رُپیہ تھا؟"

مارنر نے جواب دیا "دو سو بہتّر پاونڈ بارہ شلنگ اور چھ پنس۔ کل ہی رات کو میں نے گنے تھے۔"

لوہار بولا "اچھا میں تمھارے ساتھ چلتا ہوں تاکہ تمھارے گھر کا معائنہ کر لوں۔ اس کے بعد میں سپاہی کو مطلع کر دوں گا۔" مارنر غم زدہ ہو کر لوہار کے ہمراہ روانہ ہو گیا۔

اب ذرا دوسری طرف کے حالات سنیے :

ڈینسٹن کی غیر حاضری پر دوسرے دن گاڈفری ایک گھوڑے پر سوار ہو کر اس کی تلاش میں نکلا۔ راستے میں ایک سوار آتا دکھائی دیا۔ گاڈفری سمجھا کہ وہ ڈینسٹن ہے مگر جب سوار نزدیک آگیا تو پتا چلا کہ یہ تو میجر برائس ہیں۔ برائس نے گاڈفری کو دیکھ کر اپنا گھوڑا روک لیا اور کہا "مسٹر گاڈفری تمھارے بھائی تو بڑے خوش نصیب نکلے"۔

گاڈفری نے حیرت سے پوچھا "اس کا کیا مطلب ؟" برائس نے کہا "تو کیا وہ اب تک گھر نہیں پہنچے ؟"

گاڈفری نے کہا "نہیں، کیوں کیا ہوا ؟" اس کے بعد برائس نے ڈینسٹن کے گرنے اور گھوڑے کے مرجانے کا واقعہ بیان کیا اور رخصت ہو گیا۔ اس سانحے کی خبر سے گاڈفری بے حد رنجیدہ اور پریشان ہو گیا۔ اس نے طے کر لیا کہ اپنے والد سے تمام واقعات سچ سچ بیان کر دوں گا چناں چہ دوسرے دن صبح جب رئیس کیس سے گاڈفری نے ڈینسٹن اور گھوڑے کے بارے میں بتایا تو وہ بے حد ناراض ہوئے اور کہنے لگے کہ گاڈفری کے لیے اپنی زندگی سنوارنے کا اب صرف ایک ہی راستہ رہ گیا ہے اور وہ یہ کہ وہ مس نینسی لمبٹر سے شادی کرے۔

چند روز بعد نئے سال کی آمد کی خوشی میں سُرخ محل میں خوب جشن منایا جا رہا تھا کہ اتنے میں مسٹر لمبٹر اور ان کی صاحب زادی بھی آپہنچی۔ گاڈفری نے لپک کر اُن کا استقبال کیا۔ پھر گاڈفری اور مس نینسی باتیں کرنے لگے۔ عورتیں آپس میں یہ چہ میگوئیاں کرنے لگیں کہ ان دونوں کا جوڑا نہایت اچھا رہے گا۔ عین اسی وقت جب گاڈفری مس نینسی کی موجودگی سے لطف اندوز ہو کر خود فراموشی کے گھونٹ پی رہا تھا۔ ریویلیو سے کچھ ہی فاصلے پر ایک چھوٹی سی جھونپڑی میں ایک چھوٹا ڈراما کھیلا جا رہا تھا جہاں گاڈفری کی بیوی مولی فیرن جس سے اُس نے خفیہ طور پر شادی کی تھی اور اپنی شیر خوار بچی کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ مولی فیرن جلدی جلدی سفر کی تیاریاں کر رہی تھی۔ ننھی بچی حیرت سے اپنی ماں کو دیکھ رہی تھی۔

مولی فیرن بال سنوارتے ہوئے بچی کو مخاطب کر کے بولی "میری بچی، ہم لوگ اب

تمہارے دادا کے پاس چل رہے ہیں۔ وہ ریویلو کے مشہور رئیس ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ تمہارا نالائق باپ اب اس طرح سے تمہاری پرورش کرے جو ایک رئیس کی پوتی کے شایانِ شان ہو۔"

چناں چہ مولی فیرن اپنی بچی کو سینے سے چمٹائے گھر سے نکل پڑی۔ اس وقت طوفان بھی شروع ہو چکا تھا مگر مولی فیرن نے طے کر لیا تھا کہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو آج وہ رئیس کیس کے پاس پہنچ کر سب کچھ بتا دے گی۔ برف باری تیز ہو گئی، مگر مولی فیرن بچی کو کلیجے سے لگائے لڑکھڑاتی ہوئی آگے ہی بڑھتی گئی۔ کچھ دور جا کر اس پر نقاہت چھا گئی اور وہ مجبور ہو کر زمین پر گر پڑی۔ بچی نادان تھی، لیکن وہ اتنا سمجھ گئی کہ اس وقت مدد کی ضرورت ہے۔ کچھ دیر تو وہ اپنی ماں کو پکارتی رہی، لیکن جب کوئی جواب نہ ملا تو وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ کچھ دور اُسے روشنی نظر آ گئی۔ چناں چہ وہ اس روشنی کی طرف چل پڑی۔ بات یہ تھی کہ سائلس مارنر کے گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور روشنی وہیں سے آ رہی تھی۔ سائلس مارنر کھڑا ہوا تھا، مگر اس پر وہی دورے والی کیفیت طاری تھی لہٰذا اسے بچی کے آنے کی مطلق خبر نہ ہو سکی۔ بچی ننھے ننھے قدم رکھتی ہوئی مارنر کے گھر میں داخل ہو گئی اور آگ کے پاس جا کر لیٹ گئی۔ ذرا ہی دیر میں وہ سو گئی۔ مارنر کا دورہ جب ختم ہوا اور ہوش و حواس درست ہوئے تو وہ آہستہ آہستہ آگ کی طرف بڑھا۔ یکایک اس کی نظریں بچی کے سنہرے بالوں پر پڑیں۔ مارنر کو ایک دم سے یہ خیال آیا کہ اس کا کھویا ہوا سونا رکھا ہوا ہے۔ چناں چہ وہ اس کی طرف لپکا۔ اب جو اس نے ہاتھ بڑھا کر اپنے سونے کو اٹھانا چاہا تو بچی کے نرم نرم بال اس کے ہاتھ لگے۔ اب مارنر کی سمجھ میں آیا۔ وہ بول اُٹھا

"ارے یہ تو ایک ننھی سی بچی ہے! مگر بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ آخر آئی کدھر سے؟ میں نے تو اسے گھر کے اندر آتے دیکھا ہی نہیں..... شاید کسی نامعلوم طاقت نے میری کھوئی ہوئی دولت کا نعم البدل مجھے اس طرح دیا ہے!"

ذرا دیر بعد بچی جاگ اُٹھی اور اپنی ماں کو پکار پکار کر رونے لگی۔ یکایک مارنر کے دل میں بچی کی محبت اُجاگر ہوئی اور اس نے جلدی سے بچی کو گود میں اٹھا لیا اور بولا،

"میں ابھی تمہاری ماں کو ڈھونڈتا ہوں، مگر پہلے اپنے چچا سائلس سے تھوڑا سا دلیا تو کھا لو۔"

(باقی آئندہ)

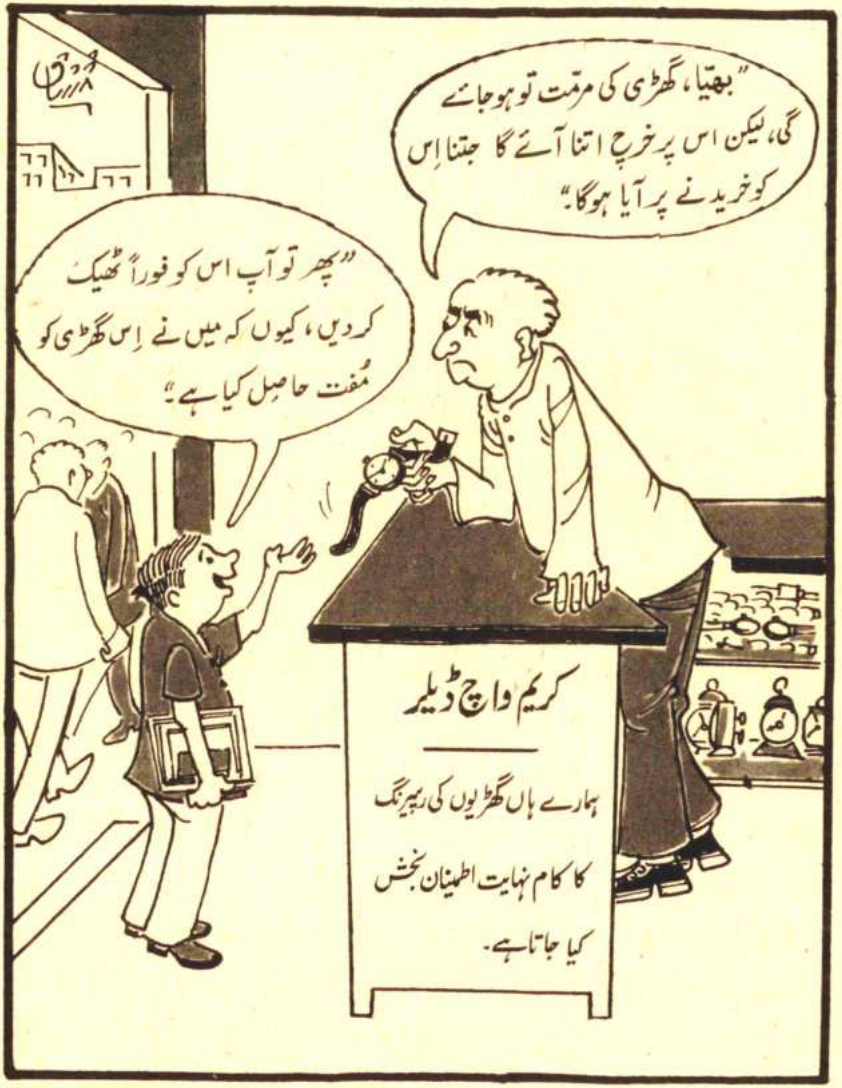
"بھیّا، گھڑی کی مرمّت تو ہو جائے گی، لیکن اس پر خرچ اتنا آئے گا جتنا اِس کو خریدنے پر آیا ہوگا۔"
"پھر تو آپ اس کو فوراً ٹھیک کر دیں، کیوں کہ میں نے اِس گھڑی کو مُفت حاصِل کیا ہے۔"
کریم واچ ڈیلر
ہمارے ہاں گھڑیوں کی ریپیرنگ کا کام نہایت اطمینان بخش کیا جاتا ہے۔

ایک ادیب ایک اِنسان

سید رشید الدین احمد

جنوری ۱۹۵۰ء کی بات ہے، میں ممتاز ریاضی داں ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کے ساتھ حیدرآباد (دکن) سے علی گڑھ پہنچا تھا۔ ہم ڈاکٹر افضال قادری مرحوم کے گھر مہمان تھے۔ ڈاکٹر صاحب کو علی گڑھ میں کچھ کام تھا، بلکہ بہت کچھ کام تھا، کیوں کہ وہ ابھی ابھی عثمانیہ یونی ورسٹی کی وائس چانسلری سے سُبک دوش ہوئے تھے اور ڈاکٹر ذاکر حسین کے اصرار پر علی گڑھ اُٹھ آئے تھے۔ مجھے علی گڑھ میں پڑھنا تھا۔ داخلے کے دن تو نہیں تھے، لیکن میرے والد سید انیس الدین ایڈوکیٹ مرحوم کا خیال تھا کہ علی گڑھ میں جس قدر وقت گزرے بہتر ہے۔ وہ علی گڑھ کی فضا کو کیمیا تاثیر سمجھتے تھے۔ بڑی سخت سردی پڑ رہی تھی۔ دروازے پر دستک ہوئی، ڈاکٹر افضال قادری باہر گئے اور ایک بزرگ کو اپنے ساتھ کمرے میں لے آئے۔ اُنھیں دیکھتے ہی ڈاکٹر رضی الدین صدیقی فوراً کھڑے ہوگئے اور

"رشید صاحب" کہہ کر لیٹ گئے۔ آنے والے بزرگ بڑے متین اور سنجیدہ تھے۔ عینک کے اُس پار اُن کی آنکھوں کی چمک اُن کے خلوص، ذہانت اور محبت کی غمازی کر رہی تھی۔ تعارف ہوا تو معلوم ہوا کہ یہ رشید احمد صدیقی ہیں "گنج ہائے گراں مایہ" والے، ان کی تحریروں سے ان کے بارے میں جو تاثر ذہن میں تھا وہ اس کے بالکل برعکس نظر آئے۔ بڑے لوگوں کی شخصیت کے بارے میں انھوں نے جو کچھ لکھا تھا اس سے ان کے بارے میں کچھ ایسا نقشہ تھا کہ وہ کسی جامع مسجد کی طرح ہوں گے اونچے باوقار جو ہر چیز بلندی سے دیکھتی ہے۔ رفعتوں کی ہم دوش بھی ہے اور پورے شہر میں نمایاں بھی۔

کچھ دنوں بعد ہم ذاکر صاحب کی کوٹھی کے مقابل والے بنگلے میں منتقل ہو گئے تو رشید صاحب ہر شام باقاعدہ آنے لگے۔ اس موقع پر اور بھی لوگ ہوتے تھے جن کی عالمانہ گفت گو سننے کا مجھے شرف اور موقع ملتا تھا، لیکن میں نے محسوس کیا کہ ان سب میں رشید صاحب کی گفت گو سننے کے سب ہی تمنائی ہوتے۔ رشید صاحب کو سیاست سے کوئی دل چسپی نہیں تھی، وہ انسانیت کے قائل تھے۔ تقسیم ہند کے وقت لگے ہوئے گھاؤ ابھی تک تازہ تھے۔ رشید صاحب کے خیال میں علی گڑھ کی بہار لُٹ چکی تھی، لیکن وہ بدستور اپنے اسی سُونے سُونے چمن ہی میں رہنے پر مُصر تھے۔ وہ بڑے دُکھ کے ساتھ کہا کرتے:

"آزادی وہ کچھ نہیں لائی ڈاکٹر صاحب! جس کی توقع تھی"۔

ان نشستوں میں ہر موضوع پر گفت گو ہوتی۔ سائنس اور بین الاقوامی موضوعات پر وہ ڈاکٹر صدیقی سے اپنے مخصوص انداز میں سوالات کرتے اور بڑی توجہ سے سنتے اور اس دوران دھیرے سے "ہُوں" کہہ کر تبصرہ کرتے یا پھر کوئی اور سوال۔

ایک روز کھانے کے دوران ہاتھ کو مخصوص انداز میں حرکت دے کر پوچھا،

"ڈاکٹر صاحب! آپ تو انگریزی کے علاوہ جرمن اور فرانسیسی زبانوں پر بھی عبور رکھتے ہیں پھر آپ نے ملک ملک کی سیر بھی کی ہے۔ قسم قسم کے کھانے بھی کھائے ہیں۔ نت نئے ذائقوں کا لطف بھی لیا ہوگا جن کے لیے ان زبانوں میں یقیناً الفاظ بھی ہوں گے، لیکن ہمارے ہاں ایک ذائقہ ہوتا ہے جسے ہم 'سوندھاپن' کہتے ہیں۔ انگریزی میں اس کے لیے مجھے کوئی لفظ نہیں ملا، شاید آپ کے ذہن میں ہو؟"۔

ڈاکٹر صدیقی نے تھوڑی دیر غور کیا اور کہنے لگے، "جن کے پاس یہ ذائقہ ہی نہ ہو وہ لفظ کہاں سے لائیں گے"۔ یہ جواب سُن کر رشید صاحب بہت محظوظ ہوئے۔

انھیں گلاب کے پھول اور ڈاکٹر ذاکر حسین سے عشق تھا۔ وہ ذاکر صاحب کی صحبت کو صحبتِ گُل سمجھتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین کی صحبت 'گلِ حمّام' کی طرح ہر شخص کو مُشک و عبیر بنا سکتی تھی، چناں چہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"میں اچھے اور صاحبِ توفیق طالب علم کو اکثر یہ مشورہ دیتا ہوں کہ وہ کبھی نہ کبھی ڈاکٹر ذاکر صاحب سے ضرور مل آئے اور یہ اس لیے کہ میں جس متاع کو اپنے لیے گراں مایہ سمجھتا ہوں اُس میں اپنے اُن عزیز طلبہ کو بھی شریک کر لینا چاہتا ہوں جن کو عزیز سمجھتا اور گردانتا ہوں"۔

ذاکر صاحب اُن دنوں رام پور میں زیرِ علاج تھے۔ رشید صاحب صبح تڑکے اوور کوٹ پہنے ان کی علی گڑھ کی کوٹھی میں لگے ہوئے گلاب کی کیاریوں میں گھومتے۔ ہر پھول کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے اور گھر لوٹ جاتے۔ حوصلے والے انسان تھے، بلبل کا سا عشق رکھتے تھے مگر نالہ و فریاد نہیں کرتے تھے۔

علی گڑھ کو کون نہیں جانتا؟ وہی سرسیّد کا علی گڑھ، علم کا مرکز، مسلمانوں کی تربیت گاہ، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ نے قوم کو بے شمار قابل فرزند دیے۔ قوم کی تقدیر بدلنے والے، ہماری تاریخ کو روشن کرنے والے۔ ان میں لیڈر بھی تھے، وکیل بھی اور جج بھی، سائنس دان، ماہرِ تعلیم اور نامی گرامی ادیب اور شاعر بھی۔ اُسی علی گڑھ کے ایک قابل اور عظیم فرزند پروفیسر رشید احمد صدیقی تھے۔ وہ ایک بہت بڑے ادیب، مشفق استاد اور بہت اچھے انسان بھی تھے۔ بہت سے ادیب اور شاعر بڑے ہوتے ہیں لیکن بہت کم اچھے انسان بھی ہوتے ہیں۔

رشید احمد صدیقی ۱۸۹۲ء میں بجنور (یوپی) میں پیدا ہوئے اور میٹرک کرنے کے بعد ۱۹۱۵ء میں اعلا تعلیم کے لیے علی گڑھ چلے آئے اور یہیں سے ایم اے کیا۔ کتنے ہی نوجوانوں نے اس مرکزِ علم میں داخلہ لیا ہوگا، لیکن اپنی مادرِ علمی سے رشید صاحب جیسی محبت شاید ہی کسی کو ہوئی ہوگی۔ چناں چہ انھوں نے اسی کو اپنا گھر بنانے کا فیصلہ

کرلیا۔ انھیں اپنی مادرِ علمی سے عشق تھا۔

یونی ورسٹی بننے پر یہیں اُردو کے لیکچرار ہوگئے اور پھر اسی علاقے میں اپنے لیے ایک مختصر سا سادہ لیکن سلیقے کا مکان بنالیا، جس کے کچھ حصّے برسوں پھُوس کے چھپّر سے زیادہ وزنی چھت کا بوجھ نہ اُٹھا سکے۔ وہ علی گڑھ کے اصول کے مطابق "سادہ زندگی لیکن اعلا فکر و خیال" کے قائل تھے۔ انھوں نے بڑی سادہ زندگی گزاری۔ ایک معمولی سائیکل ان کی سواری ہوتی تھی۔

رشید صاحب بہت اچھا لکھتے تھے۔ ان کی تحریر میں سنجیدگی کے ساتھ طنز و مزاح کا ایک خاص رنگ ہوتا تھا۔ تیز تیز اور میٹھا میٹھا ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ جس سیاہی سے لکھتے اس میں طنز کے نشتر اور مزاح کی خوش بُو گھول لیا کرتے تھے۔

ان کے طنزیہ مضامین کے دو مجموعے "خنداں" اور "مضامینِ رشید" کے نام سے شائع ہوئے تھے۔ انھوں نے تنقیدی مضامین بھی لکھے۔ اس سلسلے میں ان کی دو کتابوں "جدید غزل" اور "غالب کی شخصیت اور شاعری" کو بڑا اہم مقام حاصل ہے۔ انھوں نے اپنے دوست احباب اور بزرگوں کے شخصی خاکے بھی تحریر کیے۔ خاکے لکھنے میں اُن کو کمال حاصل تھا۔ وہ صرف پھول چننے کے قائل تھے۔ انھوں نے ان شخصیتوں کی صرف خوبیاں ہی نمایاں کی ہیں۔ عیب جوئی اُن کی فطرت کے خلاف تھی۔ "گنج ہائے گراں مایہ" اور "ہم نفسانِ رفتہ" ایسے ہی شخصی خاکوں کے دو مجموعے ہیں۔ رشید صاحب نے بچّوں کے لیے بھی ایک کتاب "شیخ نیازی" لکھی تھی۔

وہ محبت سادگی، رکھ رکھاؤ اور وقار کے پیکر تھے۔ ان کا علمی ذوق بہت بلند تھا۔ چھوٹے بڑے ہر ایک کے ساتھ وہ محبت اور خلوص سے پیش آتے تھے۔ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے لاکھوں فرزندوں کو اس بات پر فخر ہے کہ انھوں نے وہاں تعلیم پائی لیکن ایسے بہت کم ہیں جن پر خود اس مادرِ علمی کو فخر ہے۔ رشید صاحب ان میں سے تھے جن پر علی گڑھ ناز کرسکتا ہے۔ ۱۵ جنوری ۱۹۷۶ء کو اسی صحن میں مٹی کی چادر اوڑھ کر سو گئے۔

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے!

اِقبالؒ

ناصر زیدی

سب سے الفت کرنے والا
ملّت کا دَم بھرنے والا
قوم کی آنکھوں کا وہ تارا
ہم کو جان و دِل سے پیارا
جس نے خودی کے نغمے گائے
خوشیوں کے پیغام سُنائے
جس نے وطن کو عزّت بخشی
شہرت بخشی، عظمت بخشی
جس نے سوتوں کو بھی جگایا
آزادی کا خواب سُنایا
قائدِ اعظمؒ کا ہمراہی
خود کو کہتا تھا سِپاہی

جس نے عمل کا درس دیا ہے
جِس نے کل کو آج کیا ہے
اچھے بچّو، میرے پیارو!
پاکستان کی آنکھ کے تارو!
شاعر تھا وہ اچھا، سچّا،
اور بُلند اقبالؔ تھا اس کا

بڑھتی عمر اور مضبوط تر دانت

صحیح نشوونما کے لئے غذا کو اچھی طرح چبانے اور اس کو ہضم کرنے کی قوت بے حد ضروری ہے۔ لیکن خود اس کا دارومدار مضبوط اور صحت مند دانتوں پر ہے۔ دانت اُسی وقت مضبوط، صحت مند اور خوبصورت رہ سکتے ہیں جب ان کی صحت اور صفائی کا پورا پورا خیال رکھا جائے۔

عمدہ دانت زندگی بھر کے ساتھی ہوتے ہیں۔

اُن کی پوری پوری حفاظت ہمدرد منجن سے کیجئے۔ ہمدرد منجن گہرائی تک پہنچ کر ان کی صفائی کرتا ہے۔ دانتوں کو کیڑا لگنے سے بچاتا ہے۔ مسوڑھوں کی مالش کرتا ہے اور مُنہ کی بدبو کو دور کرتا ہے۔ اس کی ہلکی ہلکی ٹھنڈک اور خوشبو بڑی دلپسند ہے۔

ہمدرد منجن

مسکراہٹ میں کشش اور دانتوں میں سچے موتیوں کی چمک پیدا کرتا ہے۔

ہمدرد

ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان

کراچی — لاہور — راولپنڈی — پشاور

ٹِک ٹِک ٹِک ٹِک

میرزا ادیب

جنگل کا وہ حصہ بڑا خوب صورت تھا۔ وہاں درختوں کے نیچے ایک نہر بہتی تھی اور تھوڑے تھوڑے فاصلے پر طرح طرح کے پھول کھلے ہوئے نظر آتے تھے۔ جنگلی جانور یہاں صرف پانی پینے کے لیے آتے تھے اور پانی پی کر چلے جاتے تھے، لڑتے نہیں تھے۔

وہاں آس پاس کی آبادیوں سے لوگ آکر پکنک منایا کرتے تھے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ کچھ دوست وہاں پہنچے۔ کھانا کھایا، تاش کھیلا، ندی میں نہائے اور چند گھنٹے گزارنے کے بعد واپس چلے مگر ان میں سے ایک آدمی اپنی جیبی گھڑی بھول گیا۔

یہ گھڑی گھاس پر پڑی ہوئی تھی کہ اُدھر سے ایک لومڑی کا گزر ہوا۔ نام تھا اس لومڑی کا تانی، اور تھی بڑی چالاک جیسا کہ لومڑیاں ہوتی ہیں۔ اُس نے جو گھڑی دیکھی تو سوچنے لگی کہ یہ کیا چیز ہے۔ جیسے ہی اسے گھڑی میں سے "ٹک ٹک" کی آواز سنائی دی اُسے بڑی خوشی ہوئی، کیوں کہ وہ سمجھتی تھی کہ اس سے کچھ نہ کچھ فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے اور اس نے فائدہ اُٹھانے کی ٹھان لی۔ گھڑی کو اٹھایا اور اس کے ساتھ جو زنجیر تھی اسے اپنی گردن کے گرد لپیٹ لیا۔ گھڑی اس کی گردن سے لٹکنے لگی۔

اُس کا گھر وہاں سے کافی دور تھا اور وہ راستے میں سوچتی جاتی تھی کہ جب جنگلی جانور اسے دیکھ کر حیران ہوں گے تو وہ اُنھیں کیا بتائے گی اور کس طرح کوئی خاص فائدہ اٹھائے گی۔ وہ چلی جا رہی تھی کہ اسے سب سے پہلے ایک بندر ملا۔

"خالہ تانی! اکڑ اکڑ کر کیوں چل رہی ہو؟" بندر نے پوچھا

"ارے بے وقوف بندر دیکھتے نہیں ہم کون ہیں؟" لومڑی نے غصّے سے کہا

"کون نہیں جانتا کہ تم کون ہو بی لومڑی تانی"۔

اچانک بندر کی نظر گھڑی پر پڑ گئی۔

"خالہ تانی! یہ کیا ہے؟" بندر نے حیرت زدہ ہو کر یہ سوال کیا۔

لومڑی اور اکڑ گئی۔

"مابدولت کے قریب آؤ"۔

بندر لومڑی کے قریب چلا گیا۔

"اپنا کان اس کے ساتھ لگاؤ" لومڑی نے بندر کو حکم دیا۔

بندر نے اپنا ایک کان گھڑی کے ساتھ لگا دیا اور جیسے ہی اسے ٹک ٹک کی آواز آئی وہ ایک دم گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔

"کچھ سمجھے احمق بندر! اللہ نے مجھے یہ چیز انعام کے طور پر دی ہے۔ یہ مجھے ہر بات بتا دیتی ہے مگر میرے سوا اس کی زبان کوئی بھی نہیں جان سکتا۔ یہ کہہ رہی ہے ٹک ٹک ٹک ٹک! اس کا مطلب ہے حاضر جناب! حاضر جناب! میں اس سے جو سوال بھی پوچھوں فوراً جواب دے دیتی ہے اور یہ جواب بالکل صحیح ہوتا ہے۔"

"اچھا؟ یہ تو بڑی عجیب و غریب چیز ہے۔"

"اور کیا! اب سنو۔ کوئی سوال پوچھو۔"

بندر نے سن رکھا تھا کہ شہر سے کچھ شکاری آ رہے ہیں جو خاص طور پر بندر پکڑ کرنے جائیں گے۔ اس نے پوچھا،

"تانی بی! اس سے پوچھئے۔ شکاری مجھے تو نہیں پکڑ لیں گے؟"

"پوچھتی ہوں۔ تم خاموش رہو۔ خبردار زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکالنا۔"

بندر خاموشی سے بیٹھ گیا۔ لومڑی نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور چند لمحوں کے بعد آنکھیں کھول کر کہا، "شکاری نہیں آئیں گے۔"

یہ جواب سن کر بندر خوش ہو گیا اور بولا "تانی جی! میں نے گھر میں کچھ پھل سنبھال رکھے ہیں۔ کہیے تو لے آؤں۔"

"لے آؤ۔" لومڑی بولی۔

تھوڑی دیر ہی گزری ہو گی کہ سارے جنگل میں یہ بات پھیل گئی کہ تانی لومڑی کو اللہ نے ایک ایسی چیز دی ہے جو بات کا جواب دے دیتی ہے مگر اس کی زبان صرف تانی ہی سمجھ سکتی ہے اور کوئی نہیں جان سکتا۔ اب تو بی لومڑی کے وارے نیارے ہو گئے۔ جو جانور بھی اس کے پاس آتا تھا وہ اس کے سوال کا جواب اُلٹ پلٹ دے دیتی تھی اور جانور یہ سمجھ کر کہ جواب بالکل دُرست ہے اور تانی جنگل کے سب جانوروں سے مختلف ہو گئی ہے، اسے کچھ نہ کچھ ضرور پیش کر دیتا تھا۔ یہاں تک کہ جنگل کے بادشاہ شیر کو بھی یہ خبر مل گئی کہ تانی لومڑی ہر قسم کے سوال کا جواب دیتی ہے۔ اس کا ایک بچہ گم ہو گیا تھا اور وہ اُس کے لیے بڑا بے چین تھا۔ اصل میں اسے ایک شکاری چڑیا گھر

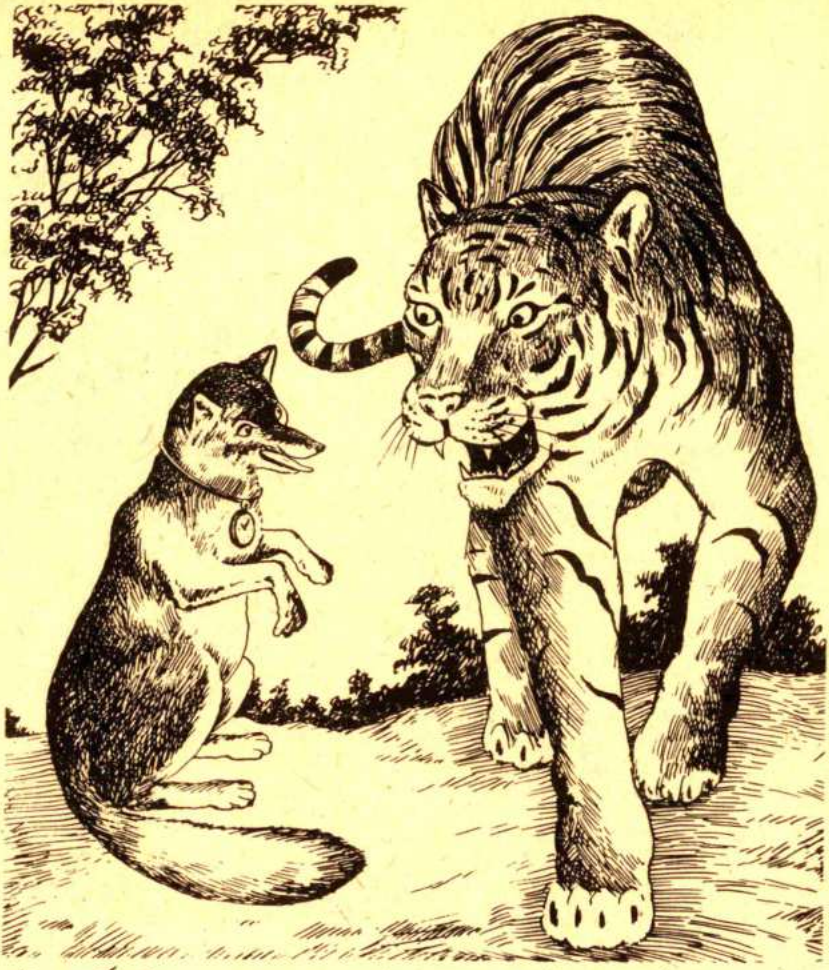

میں رکھنے کے لیے لے گیا تھا اور شیر سمجھتا تھا کہ یہ جنگل ہی میں ہے اور اس کی جگہ کا کسی کو بھی علم نہیں۔ تانی لومڑی کو اس واقعے کا علم تھا اور وہ جانتی تھی کہ کوئی شکاری شیر کے بچے کو لے گیا ہے اور شیر نے جو کچھ اس کے بارے میں سوچ رکھا ہے، غلط ہے۔

لومڑی اپنے گھر کے آگے بیٹھی تھی اور جنگل کے بہت سارے جانور بڑی خاموشی اور احترام کے ساتھ اس کے اِرد گرد حلقہ بنا کر اس کی باتیں سُن رہے تھے۔ لومڑی نے درختوں کے پیچھے شیر

کی ایک جھلک دیکھ لی اور جھٹ آنکھیں بند کرکے بولی،

"ما بدولت کو بتایا جارہا ہے کہ جنگل کا بادشاہ ہمارے حضور آرہا ہے۔"

جنگل کا بادشاہ اور لومڑی کے پاس چل کر آئے۔ اچنبھے کی بات تھی مگر سب جانوروں نے ادب سے ہاں میں سر ہلادیا۔ تھوڑی دیر بعد شیر آگیا۔ سب جانور تعظیم کے لیے کھڑے ہوگئے مگر لومڑی بیٹھی رہی۔ اُس نے اپنی آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔

"ما بدولت کو علم ہے کہ اِس وقت کون آیا ہے۔" وہ بولی۔

"نانی جی! ایک سوال پوچھنے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔"

"پوچھو۔"

"حضور نانی جی ہمارا بچّہ گم ہوگیا ہے۔ میں اور اس کی ماں اسے کچھار میں اکیلا چھوڑ کر خوراک حاصل کرنے باہر گئے تھے۔ ہمیں اس بات کا خیال نہ رہا کہ یہ بڑا شریر ہے۔ اکیلا اِدھر اُدھر نکل جاتا ہے تو۔۔۔"

"ہمیں معلوم ہے کہ تم اور اس کی ماں یعنی تم دونوں کا اپنے بچّے کی جُدائی میں بُرا حال ہے۔ خاموش ہوکر بیٹھ جاؤ۔"

شیر خاموش ہوکر بیٹھ گیا۔

لومڑی اس طرح سر ہلانے لگی جیسے وہ کوئی بات سُن رہی ہے۔

"ٹھیک ٹھیک ۔۔۔ شیر!"

"جی حضور!"

"تمھارا بچّہ اُس طرف جدھر سے سُورج نکلتا ہے ۔۔ ایک پہاڑ کے نیچے اِدھر آنے کا راستہ بھول کر اُداس بیٹھا ہے۔"

"کیا ہم اُسے اپنے گھر لا سکتے ہیں؟"

"کیوں نہیں!"

شیر نے شیرنی کو بتایا کہ ان کا بچّہ ایک پہاڑی کے نیچے اُداس بیٹھا ہے۔ وہ دونوں اس کی تلاش میں بھاگ نکلے۔ وہ منٹوں میں کہیں سے کہیں پہنچ گئے۔ انھوں نے ہر چند اپنے بچّے کو ڈھونڈا لیکن وہ کہیں بھی دکھائی نہ دیا۔ مایوس ہوکر وہ واپس آگئے

"حضور! وہ کہیں نہیں ملا۔"

"ایسا نہیں ہوسکتا۔" لومڑی نے کہا اور یکایک اسے معلوم ہوا کہ گھڑی کی ٹک ٹک بند ہوگئی ہے۔ ظاہر ہے اسے چابی دی جاتی تو اس کی حرکت جاری رہتی۔ بغیر چابی دیے اس کی حرکت کیوں کر جاری رہ سکتی تھی۔ وہ بہت گھبرائی۔ اگر کسی جانور کو معلوم ہوگیا کہ ٹک ٹک بند ہوگئی ہے تو وہ شیر کو بتادے گا اور شیر یہ سمجھ کر کہ اللہ نے اپنی چیز لومڑی سے واپس لے لی ہے، اسے چیر پھاڑ ڈالے گا۔ بولی، "میری بات غلط نہیں ہوسکتی۔ میں خود اس بچے کو واپس لے کر آتی ہوں۔"

اور وہ خود بھاگ نکلی۔ بہت دُور جاکر اس نے گھڑی کو بار بار ہلایا۔ اُسے غصّے سے ایک پتھر پر دے مارا تو وہ ریزہ ریزہ ہوگئی۔ لومڑی اور آگے چلی گئی۔ اور آگے اور پھر کبھی اس جنگل میں واپس نہ آئی۔ شیر اور شیرنی ابھی تک اس کا اور اپنے بچے کا انتظار کر رہے ہیں۔

پہلے تولو پھر بولو

کہتے ہیں کہ ہارُون رشید نے ایک دفعہ خواب میں دیکھا کہ اس کے تمام دانت گر گئے ہیں۔ اس نے صبح اِس خواب کی تعبیر ایک شخص سے پوچھی تو اُس نے کہا،

"حضور کی عمر دراز ہو، اس کا یہ مطلب نکلتا ہے کہ آپ کے تمام عزیز آپ کے سامنے فوت ہو جائیں گے۔"

بادشاہ نے کہا، "اس منحوس خبر سنانے پر اس شخص کو سو کوڑے لگائے جائیں، جب رشتے دار ہی زندہ نہ رہیں تو پھر زندگی کا کیا مزہ؟" اس نے جب ایک اور شخص سے جب اس خواب کی تعبیر پوچھی تو اس نے کہا،

"حضور کی عمر سب سے زیادہ ہوگی۔"

ہارون رشید نے کہا، "تعبیر تو اب بھی وہی ہے، لیکن الفاظ میں بہت فرق ہے۔" اس نے اس شخص کو ۱۰۰ دینار بطور انعام دیے۔ اس لیے کہا گیا ہے کہ "پہلے تولو پھر بولو۔"

ڈاکو کا ساتھی

بینک کے خزانچی کی کنپٹی پر جوں ہی کسی سخت اور ٹھنڈی ٹھنڈی چیز نے دباؤ ڈالا، اُس نے سر اُٹھایا۔ جیک ولسن نہایت مضبوطی سے پستول پکڑے ہوئے تھا اور اس کی آنکھوں سے سنگ دلی اور عزم کے شعلے لپک رہے تھے۔

"ساری نقدی دے دو..... ورنہ اپنے آپ کو مُردہ سمجھو!"

ڈاکو غرّایا۔ خزانچی نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے نوٹوں کے بنڈل اُٹھا اُٹھا کر دینا شروع کر دیے۔

..... بدنام وِلسن گروہ نے ایک بار پھر حملہ کر دیا..... پچھلے پانچ ہفتوں کے اندر وہ گیارہ ڈاکے ڈال چکے تھے۔ یہ اُن کا بارہواں ڈاکا تھا اور اس میں بھی وہ کام یاب رہے۔

سارجنٹ ٹام فلیچر کناڈا کی پولیس کے سیاہ گھوڑے پر سوار آہستہ آہستہ گیاہستان میں چلا جارہا تھا۔ ڈاکوؤں کی تلاش کے سلسلے میں اُسے طرح طرح کے خیالات آرہے تھے۔ یہ گروہ آخر کہاں چھُپ جاتا ہے؟ اُنھیں یہ کیسے معلوم ہوجاتا ہے کہ فلاں وقت ڈاکا مارنا چاہیئے ..... اور گھوڑسوار پولیس سے بچ کر نکل آنا چاہیے؟ ڈاکا ڈالنے کے فوراً ہی بعد وہ آخر کس طرح غائب ہوجاتے ہیں۔

گیاہستان جُوں ہی ختم ہوا اُس کے گھوڑے کی ٹاپیں کالی دَلدَلی زمین پر پڑیں۔ "ارے ہم تو دَلدَل تک پہنچ گئے۔" اُس نے اپنے دل میں کہا اور چاروں طرف دیکھنے لگا۔ "اب اور آگے جانا بے کار ہے۔ ڈاکو اس دَلدَل کو تو پار نہ کرسکے ہوں گے۔"

چنانچہ سارجنٹ فلیچر پولیس کے ہیڈ کوارٹر فورٹ اِیگل واپس آگیا اور سپرنٹنڈنٹ فوربس کو اپنی رپورٹ پیش کردی۔ سپرنٹنڈنٹ نے جب اُسے آرام سے کھڑے ہونے کی اجازت دے دی تو سارجنٹ نے کہا، "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ ڈاکو کس طرح وار کرتے ہیں۔ ہمارے سپاہی تو باری باری مسلسل چکّر لگاتے رہتے ہیں، مگر اس کے باوجود وِلسن کا گروہ حملہ کر دیتا ہے اور صاف بچ کر نکل جاتا ہے۔ ہمارے کسی آدمی کو یہ ڈاکو دکھائی نہیں دیتے۔"

سپرنٹنڈنٹ نے اپنی گھنی مونچھوں کو تاؤ دیا اور بولے، "سارجنٹ، میں بھی یہی غور کر رہا ہوں اور میرا خیال ہے کہ خود ہم لوگوں میں سے کوئی شخص اُن کو ہماری نقل و حرکت کی اطلاع کرتا رہتا ہے۔"

اس کے بعد سپرنٹنڈنٹ فوربس نے سارجنٹ کو ایک کاغذ دیا۔ "یہ رپورٹ افسر بالا کے پاس سے آئی ہے۔" سپرنٹنڈنٹ نے کہا، "اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وِلسن ایک ٹھگ اِیڈورڈ بیرنگ کے ساتھ پہلے کام کرتا تھا۔ جن لوگوں کو اس گروہ نے لُوٹا ہے اُن کے بیانات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایڈورڈ بیرنگ اب وِلسن کے ساتھ نہیں ہے۔"

"تو آپ کا یہ خیال ہے کہ ایڈورڈ بیرنگ یہ مخبری کر رہا ہے۔" سارجنٹ

نے پوچھا۔ "بہر حال اس رپورٹ میں جو حلیہ دیا ہوا ہے اس کا اطلاق تو درجنوں آدمیوں پر ہو سکتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جب تک ولسن کوئی فاش غلطی نہ کرے اُس وقت تک ہم اس کو نہیں پکڑ سکتے!"

اس کے بعد دو روز تک سارجنٹ فلیچر اس تلاش میں مارا مارا پھرتا رہا کہ کہیں پر ڈاکوؤں کے اڈے کا کوئی سراغ مل سکے۔ جب وہ فورٹ ایگل واپس آیا تو تھک کر بالکل چور چور ہو چکا تھا۔ جوں ہی وہ پھاٹک کے اندر داخل ہوا ایک سپاہی دوڑتا ہوا اس کے پاس آیا اور بولا، "سپرنٹنڈنٹ صاحب آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ کہا ہے کہ بڑی ضروری بات ہے۔"

ٹام فلیچر کا چہرہ راستے کی گرد و غبار سے اٹا ہوا تھا۔ اب جو اُس نے اپنی تھکی ہوئی آنکھوں پر ہاتھ پھیرا تو اس کے چہرے پر ایک نہایت بدنما داغ بن گیا۔ بہر حال اُس نے اپنی وردی دُرست کی اور سپرنٹنڈنٹ کے دفتر میں داخل ہو گیا۔ دفتر کے چھوٹے سے کمرے میں ایک سیاہ بالوں والا لانبا سا آدمی سپرنٹنڈنٹ سے باتیں کر رہا تھا۔

"آؤ، آؤ، سارجنٹ۔" سپرنٹنڈنٹ نے فلیچر کو دیکھ کر کہا، "ان سے ملو یہ ہیں انسپکٹر میکڈانلڈ۔ یہ ابھی بڑے دفتر سے آئے ہیں۔"

میکڈانلڈ نے سارجنٹ کو بڑے غصّے سے دیکھا۔

"معاف کیجیے گا۔" انسپکٹر نے سپرنٹنڈنٹ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، "اس سے پہلے کہ یہ آدمی میرے ساتھ اس مُہم پر روانہ ہو اسے پہلے اپنا حُلیہ دُرست کرنا چاہیئے۔ میں نے اتنا گندہ سپاہی کبھی نہیں دیکھا!"

یہ سُن کر سارجنٹ فلیچر کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

"جناب، مہربانی فرما کر انسپکٹر صاحب کو یہ بتا دیں کہ میں گزشتہ چوبیس گھنٹوں سے ویرانوں کی خاک چھانتا رہا ہوں اور ویرانوں کی گرد و غبار کو سپاہیوں کی وردی اور حُلیے کی ذرا بھی پروا نہیں ہوتی!"

"اچھا اچھا، سارجنٹ۔" سپرنٹنڈنٹ نے تیزی سے کہا، "انسپکٹر کو یہ معلوم نہ تھا۔ میں تم دونوں میں یک دلی چاہتا ہوں، کیوں کہ تم دونوں کو رینڈل والی سونے

کی کان سے ہُوپر اسپرنگس تک ان گاڑیوں کی نگہ بانی کرنا ہے جن میں تنخواہوں کا رُپیہ ہوگا۔ جاؤ اور گرم پانی سے غسل کر ڈالو۔ تمھاری ساری تھکن دور ہوجائے گی۔"

آخری جملوں میں سُپرنٹنڈنٹ کی آواز میں نرمی آگئی تھی۔ وہ سارجنٹ کو پسند کرتا تھا اور جانتا تھا کہ وہ ایک بہادر اور قابل اعتماد سپاہی ہے۔ ٹام فلیچر ابھی تک انسپکٹر کی سخت کلامی سے تلملا رہا تھا۔ بہرحال وہ گھوم کر جانے لگا مگر سپرنٹنڈنٹ ابھی تک اپنی بات پوری نہ کر پائے تھے۔ وہ بولے، "میں تم دونوں کو ایک بات خاص طور سے بتا دینا چاہتا ہوں۔" اتنا کہہ کر اُن کے چہرے پر سختی کے آثار پھر سے نمودار ہوگئے، "خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہوجائے رُپیہ والی گاڑیوں کو کسی جگہ بھی نہ روکنا۔ سیدھے لے کر یہاں آجانا۔ جیک وِلسن اور اُس کے گروہ والے گاڑیوں کو لُوٹنے کی کوشش کر سکتے ہیں..... اگر تم چلتے رہوگے تو یہ اندیشہ کم رہے گا۔"

سارجنٹ فلیچر جب گرم گرم پانی میں لیٹا تو اسے اپنی آنکھیں کھُلی رکھنا دشوار ہوگیا۔ وہ سوچنے لگا کہ آخر مجھے دوبارہ کیوں بھیجا جارہا ہے؟ لیکن اس کا جواب بھی وہ جانتا تھا۔ فورٹ ایگل میں اور کوئی شخص ان ویران مقامات کے راستوں سے واقف نہ تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ اگر میرا تبادلہ ہوجائے تو بڑا اچھا ہو، مگر فوراً ہی پھر خود کہنے لگا کہ لاحول ولاقوۃ یہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ مجھے تو یہ جگہ بہت پسند ہے۔

ایک گھنٹے بعد انسپکٹر میکڈانلڈ اور سارجنٹ فلیچر پانچ سپاہیوں کو ساتھ لے کر سونے کی کان کی طرف روانہ ہوگئے۔ یہ کام کوئی نیا نہ تھا۔ ہر ہفتے سونا حفاظت کے ساتھ ہُوپر اسپرنگس پہنچا دیا جاتا تھا اور وہاں بینک کے تہہ خانوں میں رکھوا دیا جاتا تھا۔ لیکن ان دنوں جب کہ وِلسن کا گروہ اس علاقے میں موجود تھا کوئی بات معمول کے مطابق نہیں رہ گئی تھی۔ فورٹ ایگل سے روانہ ہونے کے تین گھنٹے بعد جب سپاہیوں کی ٹولی اپنی منزل پر پہنچی تو سونے کی کان کے ملازمین دونوں گاڑیوں کو چلانے کے لیے تیار کھڑے تھے۔

انسپکٹر چلّایا، "اچھا سارجنٹ! سپرنٹنڈنٹ کے الفاظ یاد رکھنا..... کہیں پر

تاخیر نہ ہو! بس چل دو ..... اور تیزی سے چلو!"

انسپکٹر میکڈانلڈ بار بار مُڑ کر گاڑی بانوں کو اور تیز چلانے کا حکم دیتا جاتا تھا۔ اگلے گاڑی بان نے احتجاج کرتے ہوئے کہا، "اس سے زیادہ تیز اگر ان جانوروں کو دوڑایا جائے گا تو یہ گر پڑیں گے۔ انسپکٹر صاحب، ذرا آہستہ چلوائیے!" یہ سُن کر انسپکٹر بولا، "جانتے ہو یہ کام میرے سُپرد کیا گیا ہے اور مجھے یہ حکم ملا ہے کہ اس سونے کو جلد از جلد ہُوپر اسپرنگس پہنچا دوں۔ میں لفظ بہ لفظ اس حکم کے مطابق کام کروں گا خواہ مجھے خود تم ہی سے یہ گاڑیاں نہ کھنچوانا پڑیں!" اس حُجت کے دوران سارجنٹ فلیچر خاموش تھا مگر اب وہ بولا، "جناب، اگر ان خچروں کو آپ اسی طرح بھگاتے رہے تو یہ ہُوپر اسپرنگس تک نہ پہنچ پائیں گے۔" یہ سُن کر انسپکٹر کے چہرے پر خباثت نمودار ہوگئی اور اُس نے آنکھیں نکال کر سارجنٹ سے کہا، "سارجنٹ، مجھے جب تمھارے مشورے کی ضرورت ہوگی تو میں خود بتا دوں گا۔"

چنانچہ یہ لوگ گیاہستان میں آگے بڑھتے چلے گئے۔ بے چارے خچر تھکن کی وجہ سے ہانپ رہے

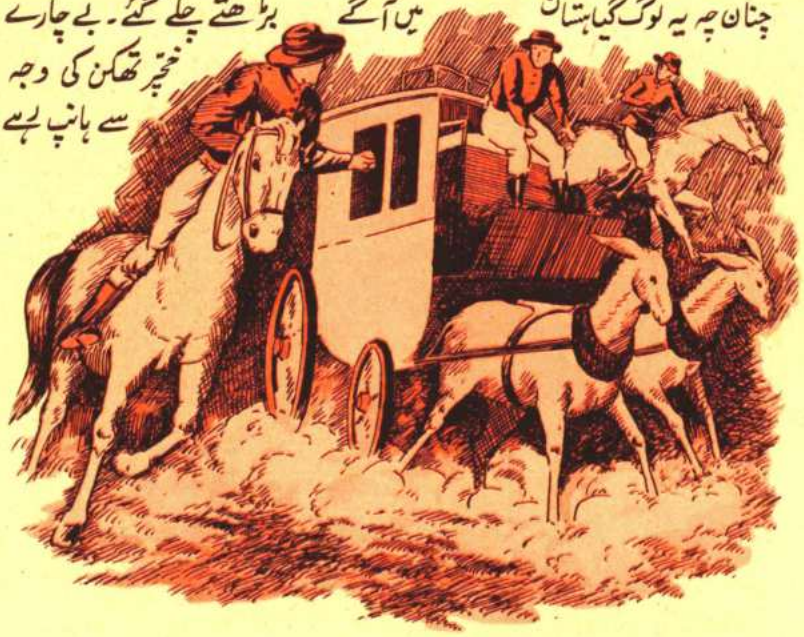

تھے۔ پھر جب ہُوپر اسپرنگس سے صرف آدھے گھنٹے کا سفر باقی رہ گیا تو اچانک گولیوں کی آوازیں آنے لگیں۔

ایک سپاہی چلّایا، "جناب، تقریباً ایک درجن سوار مغرب کی جانب سے آرہے ہیں۔" اس کا یہ کہنا بے کار ہی تھا، کیوں کہ ہر شخص جو وہاں موجود تھا وہ یہ دیکھ رہا تھا۔

سارجنٹ فلیچر نے کہا، "ہو نہ ہو یہ ولسن کا گروہ ہے۔ تیزی سے آگے بڑھو۔ ہم لوگ اُن کے آنے سے پہلے ہی قلعے تک پہنچ جائیں گے۔"

لیکن سارجنٹ فلیچر کی قسمت میں ایک انوکھی بات لکھی ہوئی تھی۔

"ہم لوگ یہاں ڈٹ کر مقابلہ کریں گے۔" انسپکٹر نے گھوڑے سے اُترتے ہوئے کہا۔ "مگر یہ تو سپرنٹنڈنٹ کے حکم کے خلاف ہوگا۔" سارجنٹ فوراً بولا، "ہم کو تو آگے ہی بڑھتے رہنا چاہیے۔"

"یہاں میرا حکم چلے گا!" انسپکٹر میکڈانلڈ نے جواب دیا، "ولسن کے گروہ کو گرفتار کرنے کا یہ بہترین موقع ہے!"

فلیچر نے کہا، "ہماری کام یابی کی کوئی اُمید نہیں! وہ لوگ ہم سے دُگنے ہیں اور کے علاوہ سپرنٹنڈنٹ کا حکم....."

"سارجنٹ، تم ایک بُزدل آدمی کی طرح باتیں کر رہے ہو۔" یہ کہہ کر انسپکٹر کا مُنھ حقارت سے ٹیڑھا ہوگیا۔ "میں نے تو سنا تھا کہ تم بہادر آدمی ہو مگر تم تو کُتّے کی طرح دُم دبا کر بھاگنا چاہتے ہو!"

سارجنٹ فلیچر اپنے غصّے کو پی گیا۔ اس بحث مباحثے کے دوران ولسن کا گروہ سونے سے لدی ہوئی گاڑیوں کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ سپاہیوں اور گاڑی بانوں نے ڈاکوؤں کی گولیوں کا جواب گولیوں سے دیا لیکن ولسن کے ساتھی بڑے چالاک تھے۔ وہ اِدھر اُدھر جھکائیاں دیتے جا رہے تھے اور گھوم گھوم کر جھپٹتے جا رہے تھے۔ اتنے میں سارجنٹ فلیچر اپنے پستول میں گولیاں بھرنے کے لیے جونہی ذرا کا تو اُس کی نظریں انسپکٹر پر پڑ گئیں۔ میکڈانلڈ کے سُرخ کوٹ کا کالر ذرا کھُل گیا تھا۔ انسپکٹر نے سارجنٹ کو گھورتے ہوئے دیکھ لیا۔ لہٰذا اُس نے گھوم کر اپنے پستول سے سارجنٹ

پر گولی چلانا چاہی، لیکن سارجنٹ فلیچر نے اس سے بھی زیادہ پھرتی دکھائی اور اس کی گولی میکڈانلڈ کے کندھے میں پیوست ہوگئی۔ انسپکٹر گر پڑا اور بے ہوش ہوگیا۔ اس کے بعد سارجنٹ تیزی سے آگے بڑھا مگر ایک آزمودہ کار سپاہی نے اپنی بندوق سارجنٹ فلیچر کے سینے پر رکھ دی۔

" سارجنٹ، تم نے یہ کیا کر دیا۔" سپاہی نے کہا، " افسروں پر گولی چلانا قانون کے خلاف ہے۔ میں نے تو تم کو کبھی بزدل نہیں سمجھا!"

اتنے میں ولسن کے گروہ نے دو سپاہیوں کو گولی کا نشانہ بنالیا تھا اور ایک گاڑی بان بھی زخمی ہو چکا تھا۔ لہٰذا ڈاکو اب خزانے پر ٹوٹنے ہی والے تھے۔

" اس گاڑی پر سوار ہو جاؤ!" سپاہی نے سختی سے سارجنٹ فلیچر سے کہا۔" اب ہمارے لیے صرف ایک ہی صورت رہ گئی ہے ..... کہ فوراً یہاں سے تیزی کے ساتھ روانہ ہو جائیں۔ تم اس گاڑی کو اب تیزی سے چلاتے رہو اور دیکھو بھاگنے کی کوشش نہ کرنا۔"

سارجنٹ فلیچر جانتا تھا کہ اس وقت یہ بتانے کا وقت نہیں ہے کہ اُس نے کیوں انسپکٹر میکڈانلڈ پر گولی چلا دی، لہٰذا وہ گاڑی پر سوار ہوگیا اور خچروں کو تیزی سے بھگانے لگا۔ گاڑیوں کے اچانک روانہ ہو جانے کی وجہ سے ولسن کے گروہ والے ذرا دیر کے لیے بھونچکا رہ گئے۔ اب خزانے والی گاڑیاں آگے آگے تیزی سے بھاگ رہی تھیں اور ان کے پیچھے پیچھے ڈاکو اپنے گھوڑے دوڑا رہے تھے اور گولیاں چلاتے جا رہے تھے۔ جیک ولسن دانت نکالے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگاتا جا رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ بس تھوڑی سی جدوجہد اور کرنی جائے اور پھر یہ سارا خزانہ میرے قبضے میں ہوگا۔

انسپکٹر میکڈانلڈ جب ذرا دیر کے لیے ہوش میں آیا تو اُس نے اپنے سینے میں بڑی شدید تکلیف محسوس کی۔ وہ ایک سپاہی کے گھوڑے پر زین کے آگے اوندھا پڑا ہوا تھا۔ اُس کے دماغ میں اس وقت صرف ایک خیال تھا۔ اس نے بڑی کوشش کر کے اپنے داہنے ہاتھ کو اپنی گردن تک پہنچانے کی کوشش کی۔ کئی بار کی کوشش کے

بعد وہ اس میں کام یاب ہوگیا۔ اس نے اپنے نیچے زمین کو بڑی تیزی سے بھاگتے دیکھا اور دوبارہ بے ہوشی طاری ہوتے ہوتے اس کا ہاتھ بے جان ہوکر گر پڑا اور اس کی مٹھی کھل گئی۔ ادھر سارجنٹ فلیچر اُچھلتی ہوئی پچھلی گاڑی پر کھڑا ہوا تھا۔ وہ خچروں کو تیز بھگانے کے لیے اتنے زور زور سے چلا رہا تھا کہ ٹاپوں کی آواز بھی ماند پڑتی جارہی تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ اس سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ ڈاکو کسی لمحہ بھی اُسے آکر پکڑ لیں گے۔ اتنے میں بوڑھا سپاہی بڑے زور سے چلّایا: "گھڑسوار! سُرخ وَردی والے! وہ مارا! ہم لوگ محفوظ ہیں!"

سارجنٹ فلیچر نے گرد و غبار کے بادلوں میں سے دیکھنے کی کوشش کی۔ بوڑھے سپاہی نے سچ کہا تھا۔ گھڑسوار پولیس کا ایک دستہ تیزی سے اِدھر آرہا تھا۔ ڈاکو ولسن نے بھی پولیس کو دیکھ لیا۔ اُس نے ہاتھ اُٹھا کر اپنے ساتھیوں کو روکا۔

"اب یہاں سے تیزی سے بھاگ چلو!" ولسن اپنے گھوڑے کو گھماتے ہوئے چلّایا، "اس بار ہم لوگ کام یاب نہ ہو سکے۔"

آنے والے سپاہیوں کے انسپکٹر نے ڈاکوؤں کا پیچھا کرنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ جانتا تھا کہ ڈاکوؤں کے گھوڑے بہت تیز رفتار ہیں اور وہ کافی دُور بھی نکل چکے ہیں۔ لہٰذا تعاقب کرنا بے کار ہوگا۔

"آپ لوگ عین وقت پر آگئے۔" بوڑھے سپاہی نے مُسکراتے ہوئے کہا، "یوں تو اس سے پہلے بھی مجھے سخت آزمائشوں سے گزرنا پڑا ہے مگر اس مرتبہ جتنی مشکلات درپیش آئیں اتنی کبھی نہیں ہوئیں۔" یہ سُن کر مدد کرنے والے سپاہیوں کا افسر بولا، "سپرنٹنڈنٹ فوربس کو یہ اندیشہ تھا کہ تم لوگوں کو راستے میں کہیں پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑ جائے اور پھر تم لوگوں کو آنے میں دیر بھی تو ہوگئی تھی۔ کیا بات ہوئی؟"

سپاہی نے سارا ماجرا کہہ سنایا اور بتایا کہ میکڈانلڈ اور فلیچر کے درمیان کیا جھگڑا ہوا۔ سارجنٹ فلیچر نے انسپکٹر میکڈانلڈ پر گولی چلا دی۔ شاید اُن کو بہت زیادہ تاؤ آگیا تھا۔

سارجنٹ فلیچر نے اپنی مدافعت میں کچھ نہیں کہا۔ بس اتنا کہا کہ فورٹ انگل پہنچ

کرتا ہوں گا۔ چنانچہ وہاں سے یہ سب سپاہی گاڑیوں کو لے کر آہستہ آہستہ فورٹ ایگل پہنچے۔ دو سپاہی سارجنٹ فلیچر کے بالکل قریب آ گئے تھے۔ سارجنٹ اُس وقت حراست میں تھا۔ انسپکٹر میکڈانلڈ کو لوگ ہسپتال لے جانے لگے۔ سارجنٹ فلیچر نے اُچٹتی نظروں سے انسپکٹر میکڈانلڈ کو دیکھا۔ میکڈانلڈ کی گردن دکھائی دے رہی تھی، کیوں کہ اُس کے کوٹ کا کالر کھُلا ہوا تھا۔ سارجنٹ اُس کی گردن دیکھ کر سکتے میں آ گیا۔ اُس کا سر چکرانے لگا۔ سپاہیوں نے اُس کو سہارا دیا اور اُسے سپرنٹنڈنٹ کے کمرے میں پہنچا دیا۔ سارجنٹ فلیچر سپرنٹنڈنٹ کی میز کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ سپرنٹنڈنٹ نہایت ناراض

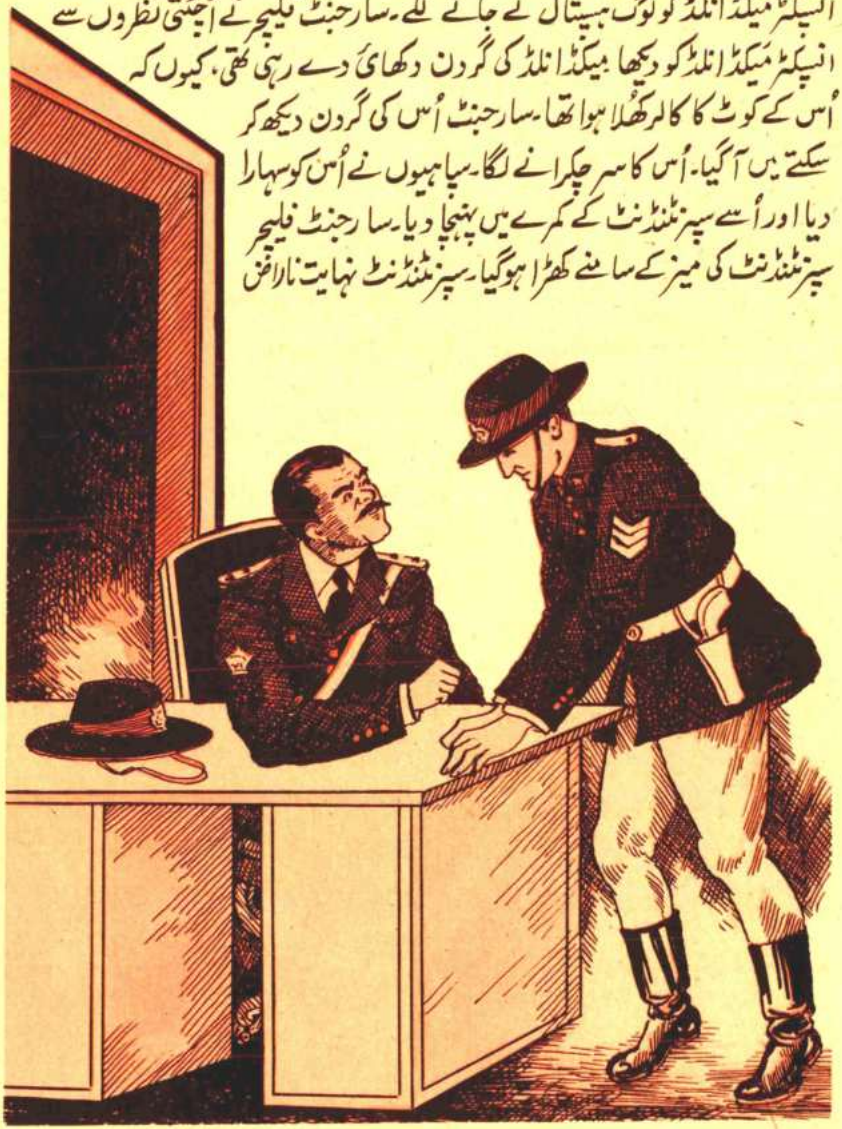

بیٹھے تھے، کیوں کہ بوڑھا سپاہی اُن کو سارا واقعہ سُنا چکا تھا۔

"یہ آخر تم کو کیا ہو گیا تھا؟" سپرنٹنڈنٹ فوربس نے حیرت سے پوچھا، "میں جانتا ہوں کہ تم بُزدل نہیں ہو مگر آج تم نے جو حرکت کی اُس سے تو یہ ثابت نہیں ہوتا!"

سارجنٹ فلیچر نے میز پر ہاتھ ٹیک کر کہا، "انسپکٹر میکڈانلڈ ایک دغا باز آدمی ہے، دھوکے باز ہے، وہ ایڈورڈ بیزنگ ہے ـــــ ڈاکو ولسن کا ساتھی!"

یہ سُن کر سپرنٹنڈنٹ بالکل سناٹے میں آ گیا۔

"یہ تو بڑا سنگین الزام ہے۔" وہ کچھ توقف کے بعد بولے، "تمھارے پاس اس کا کوئی ثبوت ہے؟" سارجنٹ کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے الفاظ کھوکھلے ثابت ہوں گے۔

"جی نہیں! ابھی میرے پاس کوئی ثبوت نہیں، مگر میں اس بات کو اچھی طرح جانتا ہوں کہ میکڈانلڈ ہی ایڈورڈ بیزنگ ہے!"

سپرنٹنڈنٹ کی تیوریاں چڑھ گئیں۔

"جب تک انسپکٹر میکڈانلڈ تمھارے اس سنگین الزام کا جواب دینے کے لائق نہیں ہوتا اُس وقت تک تم کو حراست میں رکھا جائے گا۔ اس کے بعد اگر تم ثبوت پیش نہ کر سکے تو تمھارے اُوپر قتل کا مقدمہ چلایا جائے گا۔ اب تم جا سکتے ہو!"

ایک دن گزر گیا اور سارجنٹ فلیچر اپنے کمرے میں قید رہا۔ اُس نے اپنے دماغ پر بہت زور ڈالا کہ کوئی ایسی بات ذہن میں آ سکے جس سے سپرنٹنڈنٹ فوربس کی تشفی ہو سکے۔ وہ اپنے دل میں سوچنے لگا، "میکڈانلڈ تو یہ قبول کرنے سے رہا کہ وہ ڈاکو ولسن کے گروہ سے ملا ہوا ہے، لہٰذا اب صرف ایک ہی صورت رہ گئی ہے، وہ یہ کہ ڈاکو ولسن سے یہ بات کہلوائی جائے۔ مگر وہ تو کسی خفیہ مقام پر چھپا ہوا ہے۔ اُسے تو میں ایک ہفتے میں بھی تلاش نہ کر سکوں گا!"

دوسرے دن شام کے وقت سپاہیوں کا ایک جتھا ایک آدمی کو گرفتار کر کے لے آیا۔ قیدی کو لاتے وقت سپاہیوں کے ایک افسر نے بڑی خوشی سے پھانک والے سپاہی سے کہا، "ہم نے سلم کارٹر کو پکڑ لیا جو ولسن کا دستِ راست ہے۔ یہ ہماری پہلی کامیابی ہے۔"

یہ سُن کر سارجنٹ فلیچر لپک کر کھڑکی کے پاس آگیا اور باہر دیکھنے لگا۔ افسر کہہ رہا تھا، "قیدی کو سپرنٹنڈنٹ کے پاس لے جاؤ۔ وہ اس سے سوالات کرنا چاہیں گے۔" شام کے دُھندلکے میں فلیچر نے دیکھا کہ قیدی کے گھوڑے کی ٹاپوں پر کیچڑ لگی ہوئی ہے۔ اُس کی آنکھیں تیزی سے چمکنے لگیں۔ وہ سوچنے لگا، یہ کیچڑ تو صرف ایک ہی جگہ سے آسکتی ہے — دَلدَل! وِلسن وہیں چھُپا ہوگا، مگر سپرنٹنڈنٹ سے یہ کہنا بے کار ہوگا۔ مجھے خود یہاں سے بھاگ نکلنا چاہیئے!"

سارجنٹ فلیچر کے کمرے کے باہر ایک سپاہی پہرا دے رہا تھا۔ اور فلیچر کے پاس کوئی ہتھیار بھی نہ تھا۔ کیوں کہ سب ہتھیار رکھوا لیے گئے تھے۔ مگر اس سے بھی فلیچر کی ہمت پست نہ ہوئی۔ جب خوب اندھیرا ہوگیا تو اُس نے چُپکے سے کھڑکی کھولی اور پریڈ کے میدان میں کود گیا۔ کُودتے وقت اس کی مہمیز کھڑکی کی چوکھٹ سے ٹکرا گئی وہ سائے میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ پہرے والا سپاہی اپنی جگہ سے نہیں ہِلا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ سپاہی نے کوئی آہٹ نہیں سُنی۔ چنانچہ فلیچر تیزی سے اس جنگلے کے پاس پہنچ گیا جو قلعے کے چاروں طرف بڑے بڑے لٹھوں سے بنایا گیا تھا۔ کالے کالے لٹھوں پر اوس پڑنے سے وہ خوب چکنے ہو رہے تھے۔ فلیچر جانتا تھا کہ ان لٹھوں پر چڑھنا اس کے لیے ناممکن ہے۔ "مجھے سیڑھی تک جانا پڑے گا۔" اس نے سوچا اور اس سنتری کو دیکھنے لگا جو سیڑھی کے اوپر والی مچان پر کھڑا پہرا دے رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ سیڑھی پر چڑھنے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ بچ کر نکلنا ناممکن ہے۔

"رُک جاؤ! کون ہے؟" سنتری چلّایا۔

سارجنٹ فلیچر کا مُکّہ بڑے زور سے سنتری کے جبڑے پر پڑا۔ سنتری کراہتا ہوا لکڑی کے فرش پر ڈھیر ہوگیا۔ فلیچر نے کہا، "معاف کرنا سنتری، میرا جیک وِلسن سے ملنا بڑا ضروری ہے۔"

سنتری کے للکارنے اور پھر گرنے سے جو شور وغل ہوا تو چاروں طرف سے سپاہی پریڈ کے میدان میں نکل آئے اور فلیچر کے سر کے اوپر سے گولیاں سنسناتی ہوئی گزرنے لگیں۔ فلیچر کے سامنے نیچے گیا ہستان دکھائی دے رہا تھا۔ سنتری والی مچان سے زمین

کا فاصلہ بہت زیادہ تھا۔ فلیچر کے لیے وہاں سے کُود نا بڑا دشوار تھا مگر اس کے سوا اور کوئی صورت بھی نہ تھی۔

چنان چہ وہ دل کڑا کر کے کُود پڑا اور لُڑھکتا ہوا دُور تک چلا گیا۔ پھر اسے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں سُنائی دیں، کیوں کہ سوار تعاقب میں قلعہ سے نکل آئے تھے۔ وہ بالکل دُم سادھے زمین سے چپکا رہا۔ جب سوار دُور نکل گئے تو وہ اُٹھا اور تیزی سے آگے روانہ ہو گیا۔

"مجھے گھوم کر شہر پہنچنا ہوگا اور وہاں سے ایک گھوڑا حاصل کرنا ہوگا۔" فلیچر نے اپنے دل میں کہا اور لنگڑاتا ہوا ٹکھوں کی چہار دیواری کے آڑ میں بڑھتا چلا گیا۔ اس کا داہنا ٹخنہ بالکل سُن ہو گیا تھا اور اُس کی بائیں ٹانگ میں بڑا درد ہو رہا تھا۔ دیوار پر سے چھلانگ مارتے وقت اُسے چوٹ آگئی تھی۔

بیس منٹ بعد جب وہ تیزی سے گھوڑے پر سرپٹ روانہ ہوا تو اُس کے درد میں کچھ کمی ہو گئی تھی۔ اُس نے شہر کی ایک سرائے سے ایک گھوڑا چُرا لیا تھا۔ وہاں پر چند گھوڑے باہر بندھے ہوئے تھے۔ وہ گیا ہستان میں آگے بڑھتا چلا گیا اور اُسی دلدل کے قریب پہنچ گیا جس کے بارے میں اُس نے پانچ دن پہلے یہ سمجھا تھا کہ یہاں پر ڈاکو نہیں چھُپ سکتے۔ مگر دِلسن کا جو ساتھی گرفتار کر کے لایا گیا تھا اُس کے گھوڑے کی ٹاپوں پر جو کیچڑ تھی اُس کے بارے میں شک و شبہ کی گنجائش قطعی نہ تھی۔

اتنے میں وہ کالی کالی دَلدَل کے پاس پہنچ گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ اس دَلدَل پر سے گزرنے کا کوئی نہ کوئی راستہ ضرور ہوگا، مگر مجھے اس راستے کو تلاش کرنے میں تو ایک مہینہ لگ جائے گا اور شاید اس سے پہلے ہی میں اس دَلدَل میں دھنس کر ختم ہو جاؤں گا۔ سارجنٹ فلیچر گھوڑے پر سے اُتر پڑا اور دَلدَل کے کنارے کو بڑے غور سے دیکھنے لگا۔ اُسے کوئی ایسا نشان نظر نہ آیا جس سے یہ پتا چلتا کہ اس پر سے کوئی حال ہی میں گزر چکا ہے، مگر اتنے میں یکایک ایک چیز نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کروالی۔ دَلدَل پر برچ BIRCH کے درخت کی چکنی چکنی چھال پڑی ہوئی تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ اگر میں اس درخت کی چھال کو اپنے پیروں کے نیچے باندھ لوں تو پھر شاید میں اس دَلدَل

پر بغیر دھنسے ہوئے چل سکوں..... اور ہاں کچھ فاصلے پر میں نے برچ کے درخت تو دیکھے ہیں!

اس خیال سے اُسے بڑی خوشی ہوئی۔ وہ اپنے ٹخنے کی چوٹ اور ٹانگوں کے درد کو بالکل بھول گیا اور اُچک کر گھوڑے پر سوار ہوگیا۔ ذرا ہی دیر میں وہ گھوم کر برچ کے درختوں کے پاس پہنچ گیا۔ درخت کی چھال بڑی آسانی سے نکل آئی۔ پھر دَلدَل کے پاس پہنچ کر اُس نے چھال کے دو بڑے بڑے ٹکڑے اپنے دونوں پیروں کے نیچے باندھ لیے اور آہستہ آہستہ اس خطرناک دَلدَل پر ایک ایک قدم رکھنے لگا۔ وہ بڑی احتیاط سے آگے بڑھتا چلا گیا۔ اس کے قدموں کے ساتھ درخت کی چھال چھپا چھپ دَلدَل پر پڑتی رہی اور وہ پھچا پھچ آگے بڑھتا گیا۔ مگر وہ دَلدَل میں دَھنسا نہیں۔

اس طرح آگے بڑھنے میں بڑی دیر لگی، کیوں کہ اگر ایک قدم بھی غلط پڑ جاتا تو وہ دَلدَل میں دَھنس کر مر جاتا۔

پھر کچھ دور جا کر اُسے آگ کی مَدھم مَدھم روشنی نظر آئی اور چار بوسیدہ خیمے دکھائی دیے۔ یہ خیمے سخت زمین پر نصب تھے۔ زمین کا یہ ٹکڑا کیچڑ کے سمندر میں بالکل ایک جزیرہ بنا ہوا تھا۔ اس طرح سے اُسے ڈاکوؤں کے چھپنے کی جگہ معلوم ہوگئی۔ اب جو بے ساختہ اُس کا ہاتھ پستول تلاش کرنے کے لیے پیٹی پر پڑا تو اُسے یاد آیا کہ اُس کے پاس تو کوئی بھی ہتھیار نہیں۔ وہ سوچنے لگا کہ ڈاکوؤں کو ان کے بھٹ میں سے نکالنے کی کیا ترکیب کی جائے۔

خشک زمین پر نہ تو کوئی آواز تھی اور نہ کسی قسم کی حرکت۔ فلیچر نے سوچا کہ ڈاکو اپنے خیموں میں سو رہے ہوں گے۔ پھر اُس نے آگ کی طرف دیکھا جو اب قریب قریب ٹھنڈی ہونے والی تھی۔ اتنے میں اس کی سمجھ میں آگیا کہ کیا کرنا چاہیئے۔ وہ دَبے پاؤں آگ کے پاس پہنچا اور لکڑی کا جو ٹکڑا ابھی جل رہا تھا اُسے اُٹھا لیا اور اس جلتی ہوئی لکڑی سے اُس نے سارے خیموں میں آگ لگا دی۔ ذرا ہی دیر میں شعلے بھڑکنے لگے اور دھواں اُٹھنے لگا۔ ڈاکو گھبرا کر خیموں کے باہر نکل آئے۔ اتنے میں اندھیرے میں سے ایک گرج دار آواز سُنائی دی،

"تم کو گھڑ سوار سپاہیوں نے اپنے نرغے میں لے لیا ہے۔ اپنے اپنے ہتھیار ڈال

دو۔ اور گرفتار ہو جاؤ!"

فلیچر نے دو مرتبہ اسی طرح للکارا اور یہ اُمید لگائی کہ شاید یہ فریب چل جائے۔ ڈاکوؤں پر خوف طاری ہو گیا۔ وہ جھپٹ کر اپنے گھوڑوں پر سوار ہو گئے اور دلدل کے ان محفوظ راستوں کی طرف بھاگنے لگے جو اُن کو معلوم تھے۔ فلیچر ان کا تعاقب نہیں کر سکتا تھا، کیوں کہ وہ تو اپنے پیروں کے نیچے درخت کی چھال باندھے ہوئے تھا، مگر وہ آگے بڑھتا گیا اور محفوظ سخت زمین تک پہنچ گیا۔ اتنے میں اُسے گھوڑوں کی زین لگام کی آوازیں سنائی دیں۔ گھڑسوار سپاہیوں کی ایک ٹولی اندھیرے میں سامنے سے آتی دکھائی دی اور ڈاکو ولسن کا گروہ اس ٹولی کے درمیان ہتھکڑیاں پہنے چلا آ رہا تھا۔

"سارجنٹ فلیچر!" آنے والے پولیس افسر نے فلیچر کو دیکھ کر آواز دی "کیا تم ہی نے ان سانپوں کو اس دلدل میں سے نکالا؟"

"جی ہاں انسپکٹر صاحب" فلیچر نے جواب دیا اور اپنے پیروں سے چھال کو الگ کیا۔ "میں یہ سمجھ گیا تھا کہ میرا تعاقب کیا جائے گا اور سپاہی اس دلدل کے چاروں طرف چکر لگائیں گے۔ اب قلعے چلو، ولسن کو وہاں پہنچ کر ایک آدمی کو شناخت کرنا ہے۔"

جب یہ لوگ فورٹ ایگل پہنچے تو صبح کی روشنی نمودار ہو رہی تھی۔ انسپکٹر میکڈانلڈ کا اپریشن کیا جا چکا تھا اور گولی نکالی جا چکی تھی۔ اب جو اُس نے ولسن کو دیکھا تو وہ بالکل بدحواس ہو گیا۔ سپرنٹنڈنٹ فوربس صرف میکڈانلڈ کا چہرہ ہی دیکھ کر سمجھ جاتے کہ ولسن اور میکڈانلڈ میں گٹھ جوڑ ہے۔ مگر ولسن نے خود ہی اپنے دوست کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ "اگر میں جیل جاتا ہوں تو ایڈورڈ بیزنگ بھی میرے ساتھ جائے گا۔" ولسن نے غرّا کر کہا، "اُس نے خزانے والی گاڑیوں کے معاملے میں ہم کو دھوکا دیا!"

بعد میں سپرنٹنڈنٹ فوربس نے فلیچر سے علاحدہ باتیں کیں۔

"فلیچر، مجھے تمھاری دلیری کے بارے میں تو خیر کبھی شک نہیں ہوا مگر کچھ عرصہ

کے لیے تمھارے حالات واقعی بڑے خراب ہو گئے تھے۔ تم کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ انسپکٹر میکڈانلڈ ہی ایڈورڈ بیزنگ ہے؟"

یہ سُن کر سارجنٹ مُسکرایا، "میں نے اُس کی گردن میں ایک تعویذ بندھا دیکھ لیا تھا۔ اُس تعویذ پر دو حروف بنے ہوئے تھے۔ "الف" اور "ب"۔ مجھے یہ بات محض اتفاقیہ نہیں معلوم ہوئی۔ لہٰذا خزانے کو بچانے کی میرے پاس صرف ایک ہی ترکیب رہ گئی تھی کہ میں اس کو پہلے گولی مار دوں!"

"مگر ہم لوگوں نے تو اس کی گردن میں کوئی تعویذ نہیں پایا۔" سپرنٹنڈنٹ نے کہا۔

"جی ہاں، میں جانتا ہوں۔" سارجنٹ نے کہا، "اسی لیے تو میرے پاس کوئی ثبوت نہ تھا۔ یا تو وہ زنجیر جس میں تعویذ بندھا تھا ٹوٹ گئی یا خود ایڈورڈ بیزنگ نے اس کو راستے میں کہیں پھینک دیا۔"

ولسن کے گروہ کی گرفتاری کی خبر بڑی تیزی سے سارے قلعے میں پھیل گئی۔ سارجنٹ کی صداقت کے بارے میں تو خیر کسی کو شک نہ تھا مگر جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ سارجنٹ نے کس بہادری سے ڈاکوؤں کے گروہ کو تن تنہا گرفتار کروا دیا تو ہر ایک اُس کی بہادری کا لوہا مان گیا۔

ہمدرد صحت

صحت کے طریقے اور جینے کے قرینے سکھانے والا رسالہ

- صحت کے سہل اور سادہ اُصول
- درازیٔ عمر اور بڑھاپے کے سدِ باب کے طریقے
- نفسیاتی و ذہنی اصلاح اور تربیتِ کردار
- گھریلو مسائل اور تجربے کی باتیں
- غذا، پرہیز اور حفظِ ماتقدم
- بیماریوں کی علامات، اسباب اور علاج
- تازہ ترین طبی معلومات، تحقیقات اور تجربات

ہمدرد صحت میں اس قسم کے مفید موضوعات پر ہر ماہ دل چسپ، معلومات افزا اور خیال انگیز مضامین شائع ہوتے ہیں۔ قیمت: ایک رسالہ دو روپے۔ سالانہ بیس روپے

دفتر ہمدرد صحت، ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن (پاکستان) کراچی ۱۸

پیارے بچو! جاگو جگاؤ۔ علم حاصل کرو اور علم کی شمع ہاتھ میں لے کر دوسروں تک علم کی روشنی پہنچاؤ۔ علم حاصل کرنا اور دوسروں تک علم کی روشنی پہنچانا بڑا مقدس کام ہے۔ (حکیم محمد سعید)

ہمدرد انسائیکلوپیڈیا

س: زکام کیوں ہوتا ہے؟ اس کا علاج بھی بتائیے۔

(جمیل احمد، سیال کوٹ)

ج: سردی لگنے یا گرد و غبار کی وجہ سے زکام ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جس شخص کو زکام ہو رہا ہو اس کے قریب جانے سے اور خاص طور سے اس سے ہاتھ ملانے سے بھی زکام ہو جاتا ہے۔ عام جسمانی کمزوری اور جسم کی قوتِ مدافعت کم ہو جانے سے بھی زکام کا حملہ بار بار ہو سکتا ہے۔ آج کل الرجی یا حساسیت بھی زکام کا ایک سبب بتائی جاتی ہے۔

زکام کا علاج آرام ہے۔ غذا ہلکی اور جلد ہضم ہو جانے والی کھانی چاہیئے۔ زکام کے مریض کو ایسی جگہ سکون سے لیٹ جانا چاہیے جہاں تازہ ہوا خوب آتی ہو، لیکن یہ خیال رہے کہ کھڑکی یا دروازے کے سامنے نہ لیٹیں، کیوں کہ اس طرح ہوا کے جھونکے براہ راست مریض کو لگیں گے۔

وٹامن سی (C) کا استعمال بھی نزلے میں مفید ہوتا ہے۔ دارچینی یا لیموں ملا کر سادہ چائے پینے سے بھی فائدہ ہوتا ہے۔ جوشاندہ نزلے کی بہت پرانی اور آزمائی ہوئی دوا ہے اور بے شمار لوگ جوشاندہ پی کر ہی زکام سے نجات حاصل کر لیتے ہیں۔ اگر ان تدبیروں کے بعد دو تین دن ہو جائیں اور زکام کی شکایت دور نہ ہو تو پھر اپنے معالج سے مشورہ کرنا چاہیے۔ (م-ا-ب)

س: پلاسٹک کس مسالے سے بنایا جاتا ہے اور کس نے ایجاد کیا؟

(آنسہ ناہید کریم، حیدرآباد)

ج: پلاسٹک قدرتی گوند، لاکھ یا چیڑ سے تیار کیا جاتا ہے، لیکن دنیا میں یہ اجزا اتنی زیادہ مقدار میں کہاں دست یاب ہو سکتے ہیں جتنی مقدار میں پلاسٹک تیار کیا جا رہا ہے اور استعمال ہو رہا ہے لہٰذا اب پلاسٹک بہت سے مصنوعی اجزا سے تیار کیا جا رہا ہے۔

پلاسٹک کی موجودہ صنعت صحیح معنوں میں اس وقت شروع ہوئی جب بلجیم کے ایک ممتاز کیمیا داں ڈاکٹر بیک لینڈ نے بیکلائٹ تیار کیا۔ ان کے نام کے ساتھ ہی پلاسٹک کی یہ قسم بیکلائٹ کہلائی۔ بیکلائٹ کاربالک ایسڈ اور ایک کیمیائی محلول فورمل ڈی ہائڈ کی مدد سے تیار کیا جاتا ہے۔ یہ دونوں اجزا ہماری موجودہ صنعتوں سے آسانی سے مل جاتے ہیں۔ گرم بیکلائٹ نہایت ملائم ہوتا ہے۔ اُسے سانچوں میں ڈال کر مختلف شکلوں میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً برتن، ریڈیو اور ٹیلے وژن کے کیبنٹ، بجلی کا سامان، ایش ٹرے، گلدان اور بسوں میں لگنے والی چیزیں، ہینگر، فرنیچر بلکہ اب تو بیکلائٹ یا سخت پلاسٹک کی دیواریں اور مکان تک بننے لگے ہیں۔

س: قوسِ قُزح بارش بند ہو جانے کے بعد آسمان پر کیسے نمودار ہو جاتی ہے؟

(ریاض حسین شاہ، اچھرہ۔ لاہور)

ج: آپ نے یہ بھی محسوس کیا ہوگا کہ قوسِ قُزح عام طور پر شام کو سورج کی مختلف سمت میں نظر آتی ہے۔ جب سورج کی کرنیں ترچھی ہو جاتی ہیں۔ بارش ختم ہونے کے بعد بھی فضا میں ابخرات اور پانی کے قطرے موجود رہتے ہیں۔ جب روشنی کی کرنیں ان قطروں میں سے گزرتی ہیں تو وہ منشور کا کام دیتی ہیں اور یہ شعاعیں اپنے سات رنگوں میں ٹوٹ جاتی ہیں جن کی ترتیب کچھ یوں ہوتی ہے:۔ بنفشی، کاہی، نیلا، زرد، نارنجی اور سُرخ۔ یہ سب رنگ مل کر ایک ترچھی کمان جیسی بنا دیتے ہیں جو ٹھوس نہیں ہوتی۔ اسے قوسِ قُزح کہتے ہیں۔

س: کیا ایٹم بم سے بڑھ کر بھی کوئی اور مہلک بم ہے۔ اگر ہے تو اس کے متعلق تفصیل سے بتائیے۔

(اقبال اوکھائی، کراچی)

ج: ایٹم بم اس سلسلے کا پہلا بم تھا۔ اس کے بعد اس سے کہیں زیادہ مہلک اور تباہی پھیلانے والے بم ایجاد ہو چکے ہیں۔ مثلاً ہائیڈروجن بم ـــــ ان تمام بموں کی اندرونی ساخت اتنی سادہ نہیں ہوتی کہ یہاں بیان کی جا سکے۔ جن ملکوں نے یہ بم بنائے ہیں انھوں نے ان رازوں کو بھی اپنے پاس محفوظ رکھا ہے۔ ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ جب ایٹم شق ہوتا ہے تو زبردست توانائی خارج ہوتی ہے جسے ایٹمی توانائی یا جوہری توانائی کہتے ہیں۔ اسے انسان اپنے فائدے کے لیے بھی استعمال کر سکتا ہے اور تباہی کے لیے بھی۔

س: امریکا کا راکٹ جب چاند پر گیا تھا تو اس کے آنے جانے میں کم از کم چھ سات روز لگ گئے ہوں گے۔ کیا اتنے عرصے میں راکٹ سورج کی روشنی سے جل نہیں جاتا؟

(فاروق اسماعیل موسیٰ۔ کراچی)

ج: امریکا کے راکٹ کو چاند پر گئے ہوئے تو کئی سال گزر چکے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ باہر خلا میں سورج کی شعاعیں اور دوسری شعاعیں نہایت تیز ہو جاتی ہیں لیکن شہاب یا کوئی دوسرا جسم فضا میں حرارت سے نہیں جلتا بلکہ رگڑ سے جل اٹھتا ہے اور رگڑ ہوا سے ہوتی ہے۔ آپ جانتے ہوں گے کہ ہوا کا غلاف ہماری زمین کے چاروں طرف لپٹا ہوا ضرور ہے لیکن جیسے جیسے ہم اوپر جاتے ہیں وہ پتلا ہوتا جاتا ہے۔ دو میل کے بعد ہی وہ اتنا پتلا ہو جاتا ہے کہ سانس لینا دشوار ہو جاتا ہے۔ جب راکٹ ہوا کے غلاف سے نکل کر خلا میں چلا جاتا ہے تو اُسے رگڑ کا خطرہ باقی نہیں رہتا اور وہ جلتا نہیں۔

س: جب وھیل مچھلی پانی میں رہتی ہے تو وہ سانس کس طرح لیتی ہے؟

(عبدالرزاق شوکت، سانگھڑ)

ج: وَھیل مچھلی پر ہی کیا منحصر ہے۔ سب ہی مچھلیاں پانی میں رہتی ہیں اور سانس لیتی ہیں۔ اس مقصد کے لیے قدرت نے انھیں خاص طرز کے گل پھڑے عنایت کیے ہیں۔ وھیل، مچھلیوں سے اس معنی میں مختلف ہوتی ہے کہ مچھلیاں تو انڈے دیتی ہیں جن سے خود بخود بچے نکل آتے ہیں اور وہ اپنی دیکھ بھال خود کرنے لگتے ہیں لیکن وھیل اپنے بچوں کو اپنا دودھ پلا کر پالتی ہے۔ جہاں تک بحری مخلوق کے سانس لینے کا تعلق ہے تو یہ بات یاد رکھیے کہ پانی دو اہم گیسوں، ہائیڈروجن اور اوکسیجن سے مل کر بنا ہے۔ یعنی

اس میں یہ دونوں گیسیں موجود ہوتی ہیں۔ جان داروں کی زندگی کا انحصار اوکسیجن پر ہے۔ بحری مخلوق اپنے خاص انداز میں پانی سے یہ گیس حاصل کرتی رہتی ہے اور زندہ رہتی ہے۔

س: کبھی کبھی ہمارے پیروں میں ایک کرنٹ سا پیدا ہوتا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟
(ذوالفقار احمد مغل۔ کراچی)

ج: اس میں کوئی شک نہیں کہ انسانی جسم میں بجلی موجود ہوتی ہے جس کا تعلق ہمارے جسم سے ہوتا ہے، لیکن جس کرنٹ کا آپ ذکر کر رہے ہیں وہ دراصل بجلی کی رَو نہیں ہوتی، بلکہ جب کبھی اتفاق سے ہماری کہنی، گھٹنا یا ایسا ہی کوئی جوڑ کسی چیز سے ٹکرا جاتا ہے تو رگ و ریشے میں ایک لہر سی دوڑ جاتی ہے جسے لوگ کرنٹ سمجھتے ہیں۔

ہمارے پورے جسم میں رگوں ریشوں کا ایک جال پھیلا ہوا ہے جس کی دیکھ بھال ضروری ہے۔ پیر ہاتھ کی نس چڑھ جانا بھی عجیب سا احساس پیدا کرتا ہے اور درد بھی ہوتا ہے۔

س: ہپناٹزم کیا ہوتا ہے؟ (سید علی الدین احمد۔ کراچی)

ج: ہپناٹزم دوسروں پر چھا جانے کو کہتے ہیں۔ اگر آپ اپنی آنکھوں اور باتوں سے دوسرے شخص کی توجہ کو پورے طور پر اپنی طرف کر لیں تو اُسے کسی اور بات کا ہوش نہیں رہے گا۔ بعض لوگ اس کام میں مہارت رکھتے ہیں اور تھوڑی ہی دیر میں اپنے سامنے بیٹھے ہوئے انسان کو بے ہوش جیسا کر دیتے ہیں۔ ترقی یافتہ ملکوں میں اس علم نے اب ایک سائنس کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ بعض لوگ خاص طور پر معالج اب اس سائنس کی باقاعدہ تعلیم حاصل کرتے ہیں اور اس کے ذریعے وہ مریضوں کا آپریشن تک کر لیتے ہیں۔ دواؤں کے ذریعے مریض کو بے ہوش کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اس طرح اب ہپناٹزم کے ذریعے دانتوں کے ڈاکٹر بھی اپنے مریضوں کا علاج آسانی سے کر لیتے ہیں۔

ہپناٹزم کو اُردو میں عملِ تنویم کہتے ہیں۔

علی ناصر زیدی

اخبارِ نونہال

خزانے کے محافظ ناگ

اسٹاک ہوم میں جب پچھلے دنوں سری لنکا کی سرکاری ملکیت کے ہیرے جواہرات کی نمائش شروع ہوئی تو اس میں موٹے اور مضبوط شیشے کے یک شوکیس میں کروڑوں ڈالر مالیت کے نیلم، یاقوت اور دوسرے تراشیدہ پتھر رکھ دیے گئے ۔ اس شوکیس میں تین زہریلے ناگ بھی تھے جو اس گراں قدر خزانے کی حفاظت کر رہے تھے۔ یہ سانپ اس قدر زہریلے تھے کہ ان کے کاٹنے سے آدمی فوراً مر جاتا ہے۔ یہ ناگ بڑی تیزی سے خزانے پر لہراتے پھر رہے تھے۔

مرسلہ: محمد قاسم جان، پشاور

تیرتی ہوئی مسجد

دُنیا میں تقریباً ہر قسم کی خوب صورت مسجدیں موجود ہیں۔ کوئی اپنی خوبصورتی کے لیے مشہور ہوتی ہے تو کوئی رقبے کے لحاظ سے بڑی ہوتی ہے۔ آپ کو یہ سُن کر حیرت ہوگی کہ ایک تیرتی ہوئی مسجد بھی بنائی گئی ہے۔ یہ مسجد عرب جمہوریہ مصر (نہر سوئز) میں تعمیر کی گئی ہے۔ یہ ایک یونانی باشندے کے ذہن کا کرشمہ ہے جس کا نام پرنسیل ہے اور حال ہی میں اس عجیب مسجد کا افتتاح کیا گیا ہے۔ یہ مسجد ایک بہت بڑے بحری جہاز پر تعمیر کی گئی ہے۔ اس جہاز پر ایک مذہبی تعلیمی ادارہ اور رہنے کے کمرے بھی ہیں۔ اس تیرتی

ہوئی مسجد میں بڑی تعداد میں نمازیوں کی گنجائش موجود ہے۔

مرسلہ: محمد قاسم جان، چارسدہ

پچاس من وزنی کتاب

ملک چین کی ایک لائبریری میں ایک ایسی کتاب موجود ہے جس کا مجموعی وزن ایک چھوٹی سی لائبریری کے برابر ہے۔ یہ عجیب و غریب کتاب چینی انسائیکلو پیڈیا "چن ہنگ کوچن ٹو شو جی چینگ" ہے۔ یہ کتاب پانچ ہزار جلدوں پر مشتمل ہے اور اس کی طباعت پر چالیس سال صرف ہوئے۔ ۱۶۸۶ء میں یہ کتاب چھپنا شروع ہوئی، ۱۷۲۶ء میں ختم ہوئی۔

مرسلہ: احمد افضال، کراچی

مصنوعی ہڈیاں

چینی کے برتن بنانے والی ایک جرمن فرم چینی مٹی سے طبی مقاصد کے لیے مصنوعی ہڈیاں بنانے میں کام یاب ہوگئی ہے۔ ان ہڈیوں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ جسم انھیں قبول کر لیتے ہیں جس کے بعد وہ اصلی ہڈیوں کی طرح کام کرنے لگتی ہیں۔

مرسلہ: قاضی محمد علی کوثر، کراچی

شیشے کا سانپ

ایک انگریز سیاح رابرٹ ہکسن کو افریقہ میں سیاحت کے دوران شیشے کا ایک سانپ ملا تھا۔ یہ سانپ ایک جنگل میں ہکسن کے سامنے اپنا پھن پھیلا کر کھڑا ہوگیا۔ ہکسن نے اپنی رائفل کے کندے سے اس کے پھن پر دو تین چوٹیں لگائیں جن کی وجہ سے وہ شیشے کی طرح ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ اس نے جب ایک ٹکڑا پتھر پر پٹخا تو وہ بھی شیشے کی طرح ریزہ ریزہ ہوگیا

(مرسلہ: محمد رفیق ولد قاسم، کراچی)

جلالُو خان اور شاہی جُوتے

ایک دن میر جلالُو اپنی بہن شکار پوری سے ملنے کے لیے قصبہ ٹمبک لوٹ میں گیا۔ عادت کے مُطابق جلالُو دھما دھم پیر پٹخ پٹخ کر فرش پر چلتا جس کی وجہ سے

پورا گھر فرش سے چھت تک ہلنے لگتا۔ وہ دروازہ تو اس زوردار دھماکے سے بند کرتا کہ گھر میں موجود لوگ ہڑبڑا کر اُٹھ جاتے، در و دیوار کانپنے لگتے۔ دیواروں پر لگی ہوئی تصویریں اور کیلنڈر تڑاتڑ فرش پر گرنے لگتے۔ گھر میں گھستے ہی جلالو نے پورا حلق پھاڑ کر آواز لگائی،

"شکار پوری، کہاں ہو تم؟ میں آگیا ہوں۔"

اس کی بہن میر جلالو سے تنگ آگئی تھی، لیکن وہ ایک بزدل عورت تھی، اسے خود غرض اور زور زور سے چلّانے والے لوگ سخت ناپسند تھے۔

شکار پوری اپنے بھائی کی آواز سُن کر بھاگی ہوئی آئی، "بھیّا جلالو! تم نے اپنے آنے کی خبر تک نہ دی۔ ایک خط ہی لکھ کر مجھے اطلاع کر دیتے۔"

"ہاہاہا!" میر جلالو نے حلق پھاڑ کر قہقہہ لگایا، "تم ابھی تک وہی بزدل چوہیا رہیں، خیر کوئی بات نہیں۔ اب میں آگیا ہوں، میری موجودگی سے تمہارے اندر ضرور کوئی اچھی تبدیلی پیدا ہو جائے گی۔"

لیکن بے چاری شکار پوری کا ناک میں دم آگیا۔ دھڑام سے دروازہ بند کیا جاتا، کھٹ کھٹ کی آواز سے گھر میں شور پیدا ہوتا اور سکون غارت ہو جاتا۔ وہ دھپ سے جوتا پھینک دیتا اور ادھر اُدھر رکھی ہوئی چیزیں ٹوٹ پھوٹ جاتیں۔ بلی کی الگ شامت تھی۔ بدقسمتی سے وہ اگر کبھی جلالو کے ہاتھ لگ جاتی تو وہ اس کی اتنی پٹائی کرتا کہ بلی کی چیخوں سے بے چاری شکار پوری کا دل دہل جاتا۔ میر جلالو کی ان باتوں سے سب ہی عاجز تھے اور سب ہی لوگ اس سے نفرت کرنے لگے، لیکن جلالو کسی کو خاطر میں نہ لاتا۔

جب ربالو کی ماں شکار پوری سے ملنے آئی تو اس نے اپنا دکھڑا رویا اور افسردگی سے بولی، "بہنا! بھانجوں کے آنے کی بہنوں کو خوشی ہوتی ہے، لیکن میرا ماں جایا ایسا ہے کہ دل چاہتا ہے کہ وہ کل کا جاتا آج چلا جائے اور پھر عمر بھر کبھی ادھر کا رخ نہ کرے۔"

ربالو کی ماں نے کہا، "بہن شکار پوری، میر جلالو جیسے لوگ چیک کر رہ جاتے ہیں اور جانے کا نام نہیں لیتے۔ کوئی شخص ایسے لوگوں سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔ بہن، جلالو کو میرے گھر نہ بھیجنا۔ میرا بیٹا بہت نازک مزاج ہے، نہ جانے وہ کیا حماقت کر گزرے کہ بعد میں ہمیں شرمندگی ہو۔"

شکارپوری افسوس سے ہاتھ مل کر بولی "ہائے بہن، میں اسے کیسے روکوں۔ آج ہی میر جلالو نے رمالو کے پاس جانے کا پروگرام بنایا ہے۔ تم جانتی ہی ہو کہ وہ اتنی زور سے پاؤں پٹختا ہے کہ جوتے کی ایڑیاں ٹوٹ گئی ہیں اور جوتا بھی چل چلاؤ ہے۔ شاید آج ہی میر جمالو تمھارے ہاں اپنے جوتے مرمت کرانے کے لیے جائے گا۔

رُمالو کی ماں نے کہا، "مجھے یقین ہے کہ میرا بیٹا ایسے بدتمیز لوگوں کا کام نہیں لے گا۔"

اُسی شام میر جلالو، بھیا رُمالو کے گھر پہنچا۔ وہ دروازے پر لیٹی ہوئی بلیّوں سے ٹھوکر کھا کر گرا۔ اس کا پارا چڑھ گیا اور وہ چیخنے لگا، "جدھر دیکھو بلیّاں ہی بلیّاں ہیں۔ پتا نہیں کس حکیم نے مشورہ دیا ہے کہ بلیّاں پالو، رُمالو، اے میاں رُمالو، یہ دیکھو میں اپنے سب جوتے مرمت کروانے کے لیے لایا ہوں۔" بھیا رمالو کو میر جلالو کی چیخ پکار سخت ناگوار گزری، اُس نے اندر ہی سے کہا،

"میں مصروف ہوں، پھر کسی وقت آئیے گا۔"

میر جلالو غصّے سے چلّانے لگا، "تم میرا کام کرنے سے انکار کرتے ہو، جانتے ہو میں تم جیسے لوگوں کا بھُرتا بنا دیا کرتا ہوں۔" جلالو صاحب جلال میں آکر اس زور زور سے پاؤں پٹخنے لگا کہ بھیّا رُمالو کا مکان دھڑ دھڑ ہلنے لگا۔ میز پر رکھی ہوئی چائے دانی اور پیالی اچھل کر فرش پر آگری۔ بھیا رُمالو کے سر پر گل دان آگرا اور وہ درد سے چیخنے چلّانے لگا،

"خدا کے لیے اس بدتمیزی کو بند کرو۔ تم نہیں جانتے میں کتنے ضروری کام میں مصروف ہوں، میں بادشاہ کے لیے جوتے بنا رہا ہوں۔"

اب تو میر جلالو کو بھی حیرت ہوئی۔ اُس نے کمرے میں جھانک کر دیکھا، واقعی زری کے نہایت خوب صورت جوتے میز پر رکھے جگمگ جگمگ چمک رہے تھے۔ ایسے جوتے میر جلالو نے عمر بھر نہیں دیکھے تھے۔ اس کا دل للچایا۔ وہ بولا،

"دیکھو بھیّا رمالو! تم منھ مانگے دام مجھ سے لے لو، لیکن جوتوں کی یہ جوڑی مجھے دے دو اور میرے جوتوں کی مرمت بھی کر دو۔ چاہے اس کا مجھ سے تم دُگنا معاوضہ لے لو۔"

رُمالو نے کہا، "میں تمھاری فرمائش پر جوتوں کی مرمت تو کر دوں گا، لیکن میں یہ شاہی جوتے

تمھیں کسی قیمت نہیں دے سکتا۔"

میر جلالو غصّے سے چلّایا، "میں یہ بھی دیکھ لوں گا۔ اگر تمھیں سبق نہ دیا تو میر جلالو نام نہیں۔"

میر جلالو پاؤں پٹختا ہوا باہر نکلا۔ دروازے پر لیٹی ہوئی بلّیوں کو ٹھڈّا مار کر بھگا دیا اور گالیاں بکتا اور غصّے سے چلّاتا ہوا اپنے گھر چلا گیا۔

ربالو کی ماں کانوں میں انگلیاں ٹھونسے بیٹھی تھی، میر جلالو کے جاتے ہی وہ کمرے سے باہر آئی اور بولی، "خدا کا شکر ہے کہ وہ چلا گیا۔ اب میرے بیٹے! تم ایسی بات کرنا کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔"

ربالو نے کہا، "میں ابھی خالہ دلاور خاتون سے مشورہ کرنے جا رہا ہوں، مجھے امید ہے کہ وہ ضرور کوئی ایسی ترکیب

بتادیں گی کہ میں جلالو صاحب کو سزا دے سکوں۔"

"خالہ جان، مجھے آپ ایسی پالش دیجیے جس کو لگانے سے جوتے خود بخود چلتے رہیں۔"

خالہ جان کو اس نے پوری بات کہہ سنائی۔ تب خالہ دلاور خاتون نے ایک ایسی ہی پالش دے دی جس کو لگانے سے جوتے خود بخود چلنے لگتے ہیں۔ بھیا رُبالو نے میر جلالو کے جوتے ایک ٹوکری میں ڈالے اور اس کے گھر لے گیا۔

میر جلالو نے عادت کے مطابق ایک پیسہ بھی رُبالو کو نہ دیا، بلکہ الٹا ہی اُسے ڈانٹ ڈپٹ کر گھر سے نکال دیا۔ چلتے وقت بھیا رُبالو نے کہا،

"میر جلالو، اب شاہی جوتوں کا خیال تم دل سے نکال ہی دو، کیوں کہ میں کل صبح ہی وہ جوتے بادشاہ کو پہنچانے جا رہا ہوں۔"

میر جلالو کے چہرے پر ایک عجیب سی شیطانی چمک آ گئی۔ اس نے دل میں شاہی جوتوں کا چُرانے کا منصوبہ بنالیا۔

گھر پہنچتے ہی رُبالو نے جادو کی پالش نکالی اور اچھی طرح شاہی جوتوں پر مل دی۔ پھر اُس نے جوتوں کو الماری میں رکھا اور خود پردے کے پیچھے چھُپ کر دیکھنے لگا۔ رات کے پچھلے پہر کسی نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور دبے پاؤں چلتا ہوا کمرے میں داخل ہُوا.... الماری میں سے جُوتے نکالے پھر میر جلالو زور سے چلایا،

یہ دیکھو رُبالو، میں نے جُوتے لے لیے ہیں، اب تم انھیں مجھ سے چھین کر دکھاؤ۔"

میر جلالو جُوتے پہن کر قہقہے لگاتا ہوا باہر نکلا۔ گلی محلّے کے لوگ بھی میر جلالو کے بے ہنگم قہقہوں کو سُن کر کھڑکیوں سے جھانکنے لگے، لیکن کسی میں بھی ہمّت نہیں تھی کہ اسے کچھ کہہ سکے۔

اس کے جاتے ہی بھیّا رُبالو خوشی سے ناچتا ہوا باہر نکلا اور کہا، اس نے خود کار جُوتے پہن رکھے ہیں۔ اب وہ چلتا ہی رہے گا اور کبھی نہ رُک سکے گا۔" میر جلالو نے یہ بات سنی تو اس کی ہنسی جاتی رہی۔ اس نے لاکھ زور مارا کہ جُوتوں کو نکال پھینکے لیکن وہ کام یاب نہ ہو سکا اور نہ چلنے سے رُک سکا۔ آخر وہ چلتا چلاتا دور دراز کے ملک میں پہنچ گیا اور زندگی بھر وہاں سے واپس نہ لوٹ سکا۔

واہ بھئی رُبالو، کوئی تم سے بازی نہ جیت سکا۔

اِس شمارے کے مشکل الفاظ

- پُرآشوب — فساد بھرا، ہنگامہ خیز
- تنزّل — درجے سے گرنا، زوال
- نکبت — ذلت، بدبختی، مفلسی
- اِدبار — بدبختی، نحوست، زوال
- ذکاوت — ذہانت، تیزی
- فیضان — فائدہ، فیض
- اِکتِساب — حاصل کرنا، کمائی
- مُوازَنہ — وزن کرنا۔ اندازہ کرنا، مقابلہ
- مکتب — مدرسہ، اسکول
- ناحق — نامناسب، بلاوجہ، حق کے خلاف
- صفحۂ ہستی — دنیا
- گرداننا — قرار دینا
- اِفادیت — فائدہ
- اَفزائش — زیادتی، اضافہ
- سہواً — بلاارادہ، بھول کر۔
- اِزالہ کرنا — مٹانا، زائل کرنا، دُور کرنا
- تقلید — پیروی، نقل
- رَوَیّہ — چلن، طور طریقہ
- اَحسن — بہت نیک، بہت اچھا
- نادِرالوجُود — کم یاب، نایاب

- اِفراط — بہتات، کثرت، زیادتی
- نمودار ہونا — ظاہر ہونا۔ عیاں ہونا
- نوج — خدا نہ کرے
- نَوحہ — گریہ، ماتم
- اِبلاغ — پہنچانا، ارسال
- اَبلَق — چتکبرا جانور
- بِنَوٹ — سپہ گری کا ایک فن
- بودا — کم زور، کم ہمت
- اِشتِعال — شعلہ اٹھنا، بھڑکنا، غصہ
- تَعوِیق — دیر کرنا، ٹال مٹول
- ٹِھلیا — مٹی کا چھوٹا سا گھڑا
- ثَاقِب — روشن
- خَمر — نشہ، شراب
- جاترا۔ ہندوؤں کا اپنے مقدس مقام پر زیارت کو جانا۔ مذہبی تہوار
- حِرفت — پیشہ، ہنر
- سُرخاب — ایک آبی پرندے کا نام
- جَولان — اُچھل کود، گھوڑے کی دوڑ
- گام — قدم، پاؤں
- لَپکا — بری عادت، چسکا
- مُروَّج — جاری، رائج۔

شاہ حمید عطا
اولمپک
کھیل

یورپ کے جنوب میں یونان اور روم اب سے صدیوں پہلے بڑی طاقت ور سلطنتیں تھیں اور علم و ہنر کا مرکز سمجھی جاتی تھیں۔ ارسطو، سقراط، بقراط اور افلاطون اور ان جیسے سینکڑوں نام ور فلسفی، حکیم اور شاعر اسی علاقے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہاں کی دیو مالائی کہانیاں بڑی مشہور ہیں۔

یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب توہم پرستی عام تھی۔ لوگوں میں ایسی داستانیں اور قصّے کہانیاں مقبول تھیں جن کا حقیقت سے دُور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ زیادہ تر لوگوں کے عقیدے اور نظریات باطل تھے۔ اُن کی پسندیدہ (فرضی اور من گھڑت) کہانیاں خرافات سے پُر ہوتی تھیں اور تمام کردار اور واقعات خیالی ہوتے تھے۔

اُس وقت یہ خیال کیا جاتا تھا کہ اِس دُنیا کی ہر اچھائی بُرائی، طاقت، صفت یا خوبی کسی نہ کسی دیوتا یا دیوی کی شکل میں موجود ہے، اِس لیے وہ لوگ ہر ایسی چیز کو جو انھیں نقصان یا فائدہ پہنچاتی تھی یا جسے وہ اپنے سے الگ اور طاقت ور سمجھتے تھے، دیوی یا دیوتا جان کر پوجنے لگتے اور اس کا کوئی نام رکھ لیتے۔ ان دیویوں اور دیوتاؤں کے قصّے کہانیوں کو اساطیر کہتے ہیں۔

یہ کہانیاں اگرچہ من گھڑت اور بے بنیاد ہیں، لیکن پھر بھی ان کے مطالعے سے ہمیں انسانی تاریخ کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اور بعض بڑوں کا خیال تو یہ ہے کہ اساطیر میں انسان کی ارتقا کے راز چھُپے ہوتے ہیں، اِن سے ہمیں اخلاقی سبق بھی ملتے ہیں اور بہادری اور شجاعت کے کارناموں سے آراستہ یہ داستانیں ہمیں جوش اور ولولہ بھی عطا کرتی ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم ان کہانیوں کو اپنا رہبر بنالیں، لیکن تفریحاً انھیں پڑھنے میں کوئی حرج نہیں۔ کافی دل چسپ اور مزے دار کہانیاں ہیں۔

ان کہانیوں اور داستانوں کے لکھنے والوں میں ہومر، ورجل، اووِڈ اور اپولیس زیادہ مشہور ہیں۔

ھومر (۹۰۰ ق م) ایک رزمیہ شاعر تھا۔

وَرجِل (۷۰-۱۹ ق م) ایک لاطینی شاعر تھا جس کا پورا نام پبلیئس ورجیلئس میرو تھا۔

اووِڈ (۴۳ ق م اور ۱۸ عیسوی) یہ بھی لاطینی شاعر تھا۔ اس کا پورا نام پبلئس اوبیڈیس

نیسو تھا۔

دیومالائی کہانیاں تخلیقِ کائنات کے ابتدائی دور کے قصّے ہیں یعنی جب یہ کائنات پیدا ہو رہی تھی تب (ان کہانیوں کی رُو سے) نعوذ باللہ، دیوی اور دیوتا مختلف چیزیں بنا رہے تھے۔ کوئی سورج دیوتا تھا کوئی چاند دیوتا۔ کسی کا نام سمندر دیوتا تھا تو کوئی پہاڑ دیوتا۔ علم کی دیوی کا نام "کلیو" تھا۔ نغموں کی دیوی "اترلی" کہلاتی تھی "کالیوپ" فصاحت کی دیوی کا نام تھا۔ اور "اورینا" آسمانی حکمت کی دیوی کا نام تھا۔ دیوتا "منروا" دیوتا "بمل" دیوتا "پان" اور ان جیسے نہ جانے کتنی دیویاں اور دیوتا تھے۔ ان کے سردار یعنی سب سے بڑے دیوتا کا نام **جوپیٹر** تھا۔ دیوتاؤں کے دیوتا کو یونان کے باشندے "زیوس" کہتے تھے اور لاطینی جوپیٹر کے نام سے پکارتے تھے۔ نظامِ شمسی کے سب سے بڑے سیّارے کا نام بھی جوپیٹر ہے جسے اُردو میں مشتری کہا جاتا ہے۔ جوپیٹر تاروں، سیّاروں، بادلوں، طوفانوں، بجلیوں، جنّت اور جہنّم کا حکمراں سمجھا جاتا تھا۔ یہ "زحل" کا فرزند تھا۔ انہی دیومالائی کہانیوں کے مطابق تھیسے لی اور مقدونیہ کی سرحدوں پر ایک مقام **اولمپس** تھا۔ یہ جگہ دیوتاؤں کی نشست یا مرکز تھی۔ چوں کہ دیوتاؤں کا مرکز اولمپس تھا، اس لیے اولمپین گاڈز یا اولمپی دیوتا کہا جاتا تھا۔

قدیم یونان کے لوگ ہر چار سال بعد میلہ لگاتے تھے۔ یہ ایک طرح سے ان کا مذہبی تہوار ہوتا تھا۔ دُور دُور سے لوگ بڑی تعداد میں اس میلے میں شرکت کے لیے آتے۔ اس جشن میں یونانی اپنے سب سے بڑے دیوتا زیوس (جوپیٹر) کے اعزاز میں کھیل پیش کرتے تاکہ دیوتاؤں کی خوشنودی حاصل ہو، چوں کہ زیوس اولمپی دیوتاؤں کا سربراہ تھا اُسی مناسبت سے ان کھیلوں کو اولمپک کہا جانے لگا۔

اولمپک کھیلوں کے لیے یونانیوں نے ایک **ہپّوڈروم** اسٹیڈیم تعمیر کیا تھا۔ ہپّوڈروم اُس وسیع اور بڑے میدان کو کہا جاتا ہے جہاں رتھوں کی دوڑ ہو سکے۔ ان کھیلوں میں بھی رتھوں کی دوڑ ہوتی تھی۔ اسٹیڈیم کے اِرد گِرد بڑی بڑی شاندار عمارتیں تھیں، خوب صورت باغات اور زیتون کے بے شمار درخت تھے۔ تمام دیویوں اور دیوتاؤں کی مورتیاں رکھی ہوئی تھیں اور بیچ میں زیوس (جوپیٹر) کا مندر تھا۔ اسٹیڈیم میں تماشائیوں

کا اس قدر ہجوم ہوتا کہ تل دھرنے کو جگہ نہ رہتی۔ بگل بجائے جاتے اور پرچم بلند کیا جاتا اور فوجیں مارچ پاسٹ کرتی ہوئی گزرتیں، ان کے پیچھے مقابلوں میں حصّہ لینے والے ہوتے۔ پھر گھوڑوں پر سوار سپاہی نہایت شان کے ساتھ گزرتے۔ لوگ جوش و خروش سے نعرے بلند کرتے۔ پھر ایک نوجوان دوڑتا ہوا مندر میں جاتا اور وہاں رکھی ہوئی مقدّس اولمپک مشعل کو مندر میں جلتے ہوئے چراغ سے روشن کر کے واپس دوڑتا ہوا واپس اسٹیڈیم میں آتا اور اسے ایک اونچی جگہ پر نصب کر دیتا۔ جیسے ہی مشعل اپنی مخصوص جگہ پر رکھی جاتی، کھیل شروع ہونے کا گھنٹہ بجایا جاتا اور اس کے ساتھ ہی اولمپک کھیلوں کا آغاز ہوتا۔

سب سے پہلے رتھوں کی دوڑ شروع ہوتی، پھر خچّروں کی دوڑ شروع ہوتی۔ اس کے بعد کشتی ہوتی اور پہلوان اپنی جسمانی طاقت کا مظاہرہ کرتے۔ پھر مُکّا بازی کا مقابلہ ہوتا۔ اس کے بعد نیزہ بردار آتے اور ان کے درمیان مقابلے ہوتے اور تماشائی اُچھل اُچھل کر تالیاں بجاتے۔ آگ کے کھیل کافی خطرناک ہوتے تھے۔ اس میں کھلاڑیوں کو آگ کے دائروں میں سے بچ بچا کر نکلنا ہوتا۔ پھر ہائی جمپ کا نمبر آتا۔ پھر تلوار کی خوف ناک لڑائی ہوتی۔ دو جوان ہاتھوں میں تلواریں تھامے آمنے سامنے آتے۔ دونوں خوب صورتی کے ساتھ اپنے فن کا مظاہرہ کرتے، لیکن دونوں میں سے ہر ایک اس کوشش میں لگا رہتا کہ اپنے مقابل کو زیر کرے۔ چمکتی ہوئی تلواریں ٹکراتیں تو شرارے نکلتے۔ کھلاڑی ایک دوسرے پر لپک لپک کر وار کرتے تاکہ مقابل بوکھلا جائے اور اسی اثنا میں اس کا کام تمام کر دیں۔ اُن کی تلوار کی پیاس بجھے اور ساتھ ہی ان کے جذبۂ حیوانیت کو تسکین حاصل ہو۔ آخر کوئی نہ کوئی تلوار کا کاری زخم کھا کر گرتا اور ڈھیر ہو جاتا لیکن نہ تو فاتح کھلاڑی پر کوئی اثر ہوتا نہ تماشائی اس بارے میں کچھ کہتے۔ جیتنے والا نہایت شان سے اکڑتا ہوا تماشائیوں سے خراجِ تحسین حاصل کرتا اور کسی دوسرے کو چیلنج دیتا، اس طرح ایک مقررہ حد پر یہ مقابلہ اختتام کو پہنچتا۔ اس کے بعد پھر ایک اور خونیں مقابلہ شروع ہوتا۔ بیلوں کی لڑائی۔ دو خوف ناک بیل منھ اور ناک سے جھاگ اُڑاتے ہوئے ایک دوسرے سے ٹکراتے۔ لوگ دیوانہ وار شور مچاتے اور تالیاں پیٹتے، شرطیں لگاتے، کوئی اِس بیل کے حق میں ہوتا تو کوئی اُس بیل کے حق میں ہوتا۔ دونوں

بیل بھی اپنے دل کی بھڑاس خوب نکالتے۔ زخموں سے لہولہان ہو جاتے لیکن ہٹنے کا نام نہ لیتے۔ آخر میں ایک بیل جو خونا خون ہو چکا ہوتا میدان سے بھاگ نکلتا اور یہ کھیل ختم ہو جاتا۔

آخری کھیل ہوتا تھا شیر اور انسان کی لڑائی۔ اس میں جیتنے والے کو اولمپیڈ (OLYMPIAD) کا خطاب دیا جاتا۔ کھلاڑی حفاظتی لباس پہن کر میدان میں آتا۔ دوسرے کھلاڑی یعنی جناب شیر پنجرے میں بند میدان میں لائے جاتے..... پنجرے کا دروازہ کھولا جاتا اور جنگلی درندہ اپنے شکار کو سامنے دیکھ کر باہر آتا اور آدمی پر حملہ کرتا تاکہ پھاڑ کھائے۔ کھلاڑی طاقت استعمال کرتا اور شیر کے حملے کو ناکام بنا دیتا۔ شیر پھر بھرپور قوت سے حملہ آور ہوتا اور انسان دوبارہ اپنی کُل طاقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے شیر کو پچھاڑ دیتا۔ کبھی انسان غالب آجاتا اور کبھی وحشی جانور۔ اگر شیر انسان کو مار ڈالتا تو دوسرا کھلاڑی میدان میں اُترتا۔ یہ مقابلہ اُس وقت ختم ہوتا جب شیر کی لاش انسان کے قدموں تلے ہوتی اور وہ کھلاڑی اولمپیڈ کا خطاب حاصل کر لیتا۔ جنگل کے بادشاہ کے مقابلے میں انسان کی فتح تماشائیوں کے دلوں میں جوش و ولولہ پیدا کر دیتی اور تحسین و آفرین کے اس قدر نعرے لگائے جاتے کہ سارا اسٹیڈیم گونجنے لگتا اور لوگ اپنے اولمپک ہیرو کو اپنے کاندھوں پر اُٹھا کر رقص کرنے لگتے۔

یہ تھا قدیم اولمپکس کھیلوں کا مختصر سا حال۔ جدید اولمپک کھیلوں کا آغاز بھی یونان ہی میں ہوا۔ پہلے بین الاقوامی مقابلے ۱۸۹۶ء میں ایتھنز میں منعقد ہوئے تھے۔

کھیلوں کے یہ مقابلے ہر چار سال بعد دُنیا کے مختلف ملکوں میں منعقد ہوتے ہیں۔ ۱۹۷۲ء کے اولمپک مقابلے میونخ اور ۱۹۷۶ء کے مقابلے کینیڈا کے شہر مونٹریال میں منعقد ہوئے تھے۔ ۱۹۸۰ء کے مقابلے ماسکو میں منعقد ہونے والے ہیں۔

کھیلوں سے دوستی کی راہیں استوار ہوتی ہیں۔ دُنیا کے تمام ملک ان کے ذریعے عالمی امن، باہمی مفاہمت اور دوستی کو بڑھا کر دُنیا کی فضا کو اور خوش گوار بنا سکتے ہیں۔

سلسلہ ۱۳۲

معلومات عامہ

مُرتبہ: کھتری عِصمت علی پٹیل

سال ۱۹۷۷ء علامہ اقبال کا سال ہے۔ علامہ اقبال ہی نے پاکستان کا تصور پیش کیا تھا، اس لیے ان کا شمار پاکستان کے محسنوں میں ہوتا ہے۔ ۲۱ اپریل ان کی برسی کا دن ہے۔

اِس ماہ معلومات عامہ کے سوالات علامہ اقبال کے متعلق ہیں۔ اس طرح آپ کو علامہ اقبال کی عظیم شخصیت کے متعلق اپنی معلومات جانچنے اور بڑھانے کا موقع ملے گا۔ سوال نامے کے جوابات ۲۰ اپریل ۱۹۷۷ء تک بھیج دیجیے۔ اگر جوابات کے ساتھ تصویر بھیجنا چاہیں تو اس کے نیچے اپنا اور اپنے شہر یا قصبے کا نام ضرور لکھیے۔

۱۔ نیچے لکھی ہوئی تاریخوں میں علامہ اقبال کی دُرست تاریخِ پیدائش چُن کر لکھیے ؟

(الف) ۲۳ مارچ ۱۸۷۷ء (ب) ۲۱ اپریل ۱۸۷۶ء (ج) ۹ نومبر ۱۸۷۷ء

۲۔ چوڑی گراں بازار سیال کوٹ کو کیا تاریخی اہمیت حاصل ہے ؟

۳۔ اس مسجد کا نام بتائیے جس میں علامہ اقبال نے ابتدائی تعلیم حاصل کی ؟

۴۔ علامہ اقبال نے مڈل اور میٹرک کے امتحانات کس اسکول سے پاس کیئے ؟

۵۔ علامہ اقبال نے کس کالج سے تعلیم پاکر بی اے کی ڈگری حاصل کی۔

۶۔ ۱۸۹۹ء میں علامہ اقبال نے انجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسے میں کون سی نظم پڑھی تھی ؟

۷۔ علامہ اقبال نے سب سے پہلے کون سی کتاب لکھی اور وہ کب چھپی ؟

۸۔ انگلستان کے کس کالج اور کس یونی ورسٹی میں علامہ اقبال نے تعلیم پائی ؟

۹۔ نومبر ۱۹۰۷ء سے فروری ۱۹۰۸ء تک علامہ اقبال نے کس یونی ورسٹی میں عربی کے لیکچرار کی حیثیت سے کام کیا ؟

۱۰۔ فلسفے کے علاوہ علامہ اقبال نے کس مضمون میں اعلا تعلیم حاصل کی ؟

شہناز آرائیں ، کوٹری

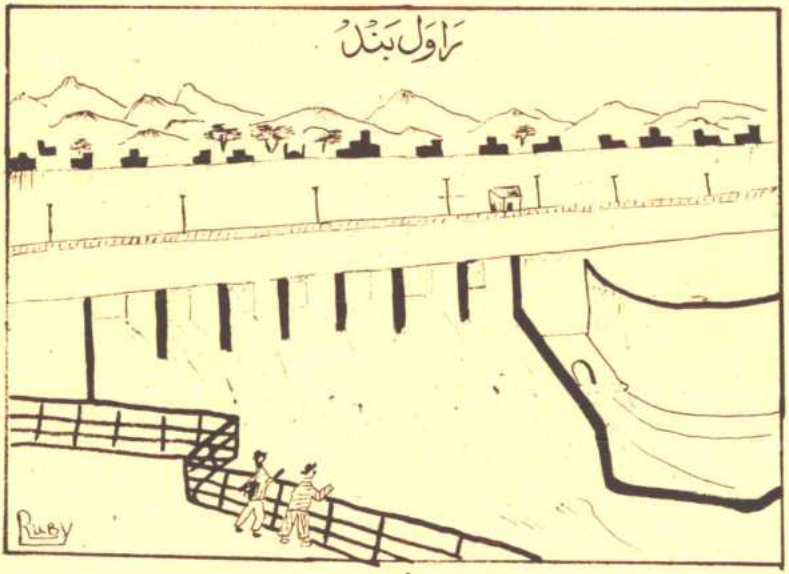

رُوبینہ انجم ، کراچی

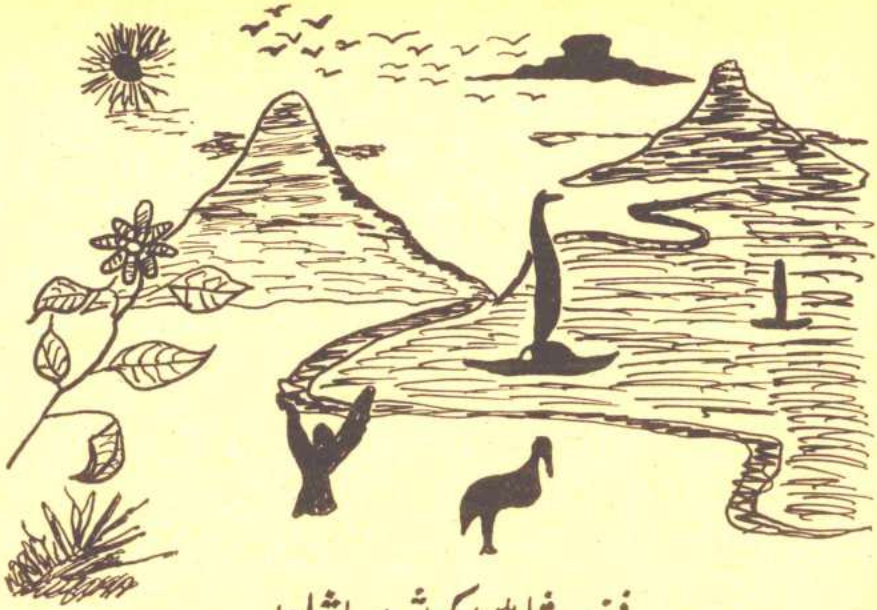

فوزیہ شاہین کوثر ، پشاور

عشرت بلقیس ، کراچی

لیونارڈو۔ دا۔ وِنسی

انور محمود، کراچی

ائر مارشل ذوالفقار علی خاں

ذوالفقار احمد ملک، چک لالا

سید وسیم اختر، کراچی

صحت مند نونہال

احسان علی، ٹنڈو محمد خاں

فاروق انصاری، کراچی

توقیر اقبال، پرانا سکھر

فرید احمد سومرو، حیدر آباد

محمد اظہر، کراچی

مجاز امین، کراچی

محمد صدیق بخاری، کراچی

ارشاد ضیاء، کراچی

سید عمران حسین زیدی، کراچی

محمد اسمٰعیل تسنیم، سکھر

ناصر حسین، کراچی

ذی شان احمد، کراچی

جاوید یعقوب، کراچی

محمد مظہر جمیل، لاہور

نوید اعظم، شب قدر، پشاور

طارق نجیب، کراچی

رنگ برنگی پھلجھڑیاں

★ ایک موٹا آدمی جو اپنے مٹاپے کی وجہ سے بے حد پریشان تھا، چوں کہ وہ مٹاپا برداشت نہیں کر سکتا تھا لہٰذا اُس نے خودکشی کی ٹھانی۔ وہ اپنے مکان کی چھت پر گیا اور نیچے چھلانگ لگا دی، مگر وہ بچ گیا جب اسے ہوش آیا تو اس نے اپنے آپ کو ہسپتال میں پایا۔ اس نے پاس کھڑے ہوئے ڈاکٹر سے کراہتے ہوئے پوچھا، "کیا میں زندہ ہوں؟"

ڈاکٹر نے جواب دیا، "جی ہاں! آپ تو زندہ ہیں، مگر وہ تینوں مر گئے جن کے اوپر آپ گرے تھے۔"

مرسلہ: آصف فضل معظم، حیدرآباد

★ استاد: (شاگردوں سے) جو جنت میں جانا چاہتے ہیں ہاتھ کھڑے کر دیں۔

سلطان کے سوا سب لڑکوں نے ہاتھ کھڑے کر دیے۔

استاد: (سلطان سے) تم جنت میں کیوں نہیں جانا چاہتے؟

سلطان: جناب میری امی نے کہا ہے کہ چھٹی ہوتے ہی سیدھا گھر آنا۔ مرسلہ: محمد اسلم بلوچ، سکھر

★ اسکول ماسٹر (بچوں سے)، بتاؤ بادل کیوں گرجتا ہے؟

ایک بچہ خوب سوچ کر اونچی آواز میں کہتا ہے، "یہ پہاڑے یاد کرتا ہے۔"

مرسلہ: سید وقار حیدر رضوی، کراچی

★ تار بابو کی بیوی فضول بکواس سے تھکے ہوئے شوہر کا دماغ پریشان کر رہی تھی، شوہر خاموش تھا۔ بیوی نے جھلا کر پوچھا، "آخر تم بولتے کیوں نہیں؟"

میاں نے سر جھکا کر جواب دیا، "میں یہ سوچ رہا ہوں کہ اگر تم اپنے میکے سے مجھے اتنے لفظوں کا تار دیتیں تو تمھارے باپ کو ۲۷۵ رُپے ۱۲ آنے صرف کرنے پڑتے۔"

(مرسلہ: عبدالحمید شہزاد، کراچی)

★ ایک افیمی (راہ گیر سے) آسمان پر جو گول سی

چیز چمک رہی ہے وہ کیا ہے؟"

راہ گیر: "ہمیں کیا پتا ہم تو پردیسی ہیں۔"

مرسلہ: علی رضا خان، کراچی

★ قطب شمالی کا ذکر کرتے ہوئے استاد نے بچے سے پوچھا کہ "بتاؤ وہ کونسا جانور ہے جو ہمیں پہننے کے لیے پوشاک اور کھانے کے لیے غذا مہیا کرتا ہے اور ہمیں سواری بھی کراتا ہے؟"

بچے نے کچھ دیر سوچنے کے بعد جواب دیا،

"ابا جان"۔ (مرسلہ: محمد ناصر، کراچی)

★ ایک آدمی نے آگے سے تو قمیض پتلون کے اندر کی ہوئی تھی، لیکن پیچھے سے نکالی ہوئی تھی۔ کسی نے پوچھا "بھائی! کیا یہ بھی کوئی نیا فیشن ہے؟"

وہ بولا "نہیں بھائی! دراصل آگے سے قمیض اور پیچھے سے پتلون پھٹی ہوئی ہے۔"

مرسلہ: عبدالوحید، کراچی

★ ننھا: "امی جلدی سے ایک روپیہ دیجئے ایک غریب آدمی کی ضرورت پوری کرنی ہے۔"

امی: "مگر وہ آدمی کہاں ہے؟"

ننھا (معصومیت سے) "گلی کے موڑ پر کھڑا ہوا آئس کریم بیچ رہا ہے۔"

★ دو امریکی، قبرستان میں اپنے ایک آں جہانی دوست کی قبر پر پھول چڑھا کر جب واپس ہوئے تو تھوڑے ہی فاصلے پر انھوں نے ایک چینی کو دیکھا جو اپنے ہم وطن کی قبر پر چاولوں کے دانے بکھیر رہا تھا۔

امریکیوں نے ازراہِ مذاق اس سے پوچھا، "تمھارا دوست یہ چاول کھانے کب آئے گا؟"۔

چینی نے جواب دیا، "اُس وقت جب تمہارا دوست پھول سونگھنے آئے گا۔"

مرسلہ: احمد جاوید ہاشمی، کراچی

★ ڈرائیور نے سامنے جھیل دیکھ کر جیپ ایک جھٹکے سے روک دی اور کھڑکی سے سر نکال کر جھیل کے کنارے بیٹھے ہوئے شخص سے پوچھا "کیوں بھئی! یہ جھیل زیادہ گہری تو نہیں ہے۔ جیپ کو اس میں سے لے جانے میں کچھ ہوگا تو نہیں؟"

وہ شخص فوراً بولا "ارے جناب! بالکل بے فکر ہو کر گزر جائیے، جیپ نہیں ڈوبے گی۔" ڈرائیور نے جیپ آگے بڑھا دی مگر ذرا سا ہی فاصلہ طے کرنے کے بعد جیپ کے تقریباً پورے پہیے ڈوب گئے۔ ڈرائیور جیپ کو پیچھے کرتے ہوئے چیخ کر بولا،

"شرم نہیں آتی جھوٹ بولتے ہوئے، میری جیپ خراب ہوگئی۔"

وہ شخص برجستہ بولا، "جھوٹ کیسا! ابھی ابھی ایک ایک بطخ بھی تو یہیں سے گئی ہے۔"

مرسلہ: محمد عثمان فریدی، کورنگی

★ ننھا: "بھائی جان! روای کہاں سے نکلتا ہے؟"

بھائی جان نے (جو غصّے میں بھرے بیٹھے تھے) کہا، "میرے سر سے"۔ ننھا، "تبھی آپ کی ناک بہہ رہی ہے۔"

مرسلہ: خالد محمود ناز، بہاول نگر

عبدالرشید غوری

سزا

ہفتے کی رات تھی، صبح بچّوں کو اسکول جانا تو تھا نہیں، اس لیے سب بچّے نانی
اماں کے اِرد گرد جمع ہو کر بیٹھ گئے اور مطالبہ کرنے لگے کہ نانی اماں! آج آپ ہمیں ضرور
کوئی اچھّی کہانی یا قصّہ سنائیے۔ نانی اماں نے کہا، "جاؤ تنگ مت کرو، میری طبیعت
ٹھیک نہیں ہے"، مگر بچّے کہاں باز آنے والے، اپنی ضد پر اَڑے رہے۔ آخر کار

نانی اماں نے ان کے سامنے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا، "اچھا میں تمھیں ایک قصّہ سناتی ہوں مگر شرط یہ ہے کہ سب خاموشی سے سننا اور پھر اس پر عمل بھی کرنا۔"

سب بچّوں نے کہا، "اچھا!" اس کے بعد نانی اماں نے اپنی پٹاری میں سے بغیر چھالیہ کا پان نکال کر مُنھ میں دبایا اور بولیں، "اچھا تو بچو! لو سنو قصّہ۔"

ایک تھا لڑکا جس کا نام تھا اسلم۔ بڑا ہی شریر تھا، اتنا شریر کہ بس کیا بتاؤں، تم لوگوں نے بچھو تو دیکھا ہی ہوگا۔ اس کی عادت ہے کہ وہ ہر گھڑی ڈنک مارتا رہتا ہے۔ بالکل یہی خصلت اسلم کی بھی تھی۔ لڑنا جھگڑنا تو گویا اس کی گھٹی میں پڑا تھا۔ سارا محلّہ اُس سے پریشان تھا، اور کچھ نہیں تو لوگوں کے گھروں میں پتھر ہی پھینکتا رہتا تھا۔ اور اگر کسی نے اس کی اُن حرکتوں پر روکا یا ٹوکا تو بس ڈھیروں آنسو بہاتا ہوا جاکر امّی سے شکایت کرتا کہ مجھے فلاں نے مارا ہے۔ اپنے لال کو اس طرح روتا ہوا دیکھ کر فوراً اس کی امّی اس کو ساتھ لے کر روکنے یا ٹوکنے والے سے جاکر لڑتیں جھگڑتیں اس طرح اسلم کی ہمّت بڑھتی رہی اور وہ خراب سے خراب تر ہوتا چلا گیا۔ سونے پر سہاگہ اس کی دوستی بھی آوارہ اور خراب لڑکوں سے تھی۔ اب وہ اسکول سے بھی غائب رہنے لگا تھا، دن بھر دوستوں کے ساتھ آوارہ گردی کرتا اور جب چھٹّی کا وقت ہوتا تو کتابیں بغل میں دباکر گھر پہنچ جاتا، لیکن بکرے کی ماں کب تک خیر مناتی ؟

ایک دن کیا ہوا کہ اسلم کے ابّو کا اس کے اسکول کی طرف جانا ہوا انھوں نے سوچا چلو اسلم کو بھی دیکھ لیں گے اور اس کے ماسٹر سے بھی مُلاقات کر لیں گے، لیکن جب وہ اسکول گئے تو اسلم کے ماسٹر صاحب سے پتا چلا کہ اسلم اب اکثر غیر حاضر رہنے لگا ہے اور آج دو روز سے تو وہ بالکل غائب ہے۔ یہ سُن کر اسلم کے ابّو کو بڑی حیرت ہوئی، کیوں کہ اسلم ان کے سامنے صبح اسکول گیا تھا۔ بڑے شرمندہ ہوئے، خاموشی سے لوٹ گئے۔ کام سے فارغ ہوکر سیدھے گھر گئے اور اسلم کی امّی سے پوچھا! "اسلم کہاں ہے؟"

اسلم کی امّی نے کہا، "وہ اسکول گیا ہوا ہے، ابھی آتا ہی ہوگا۔"

اسلم کے ابّو نے کہا، "آج اُسے آنے دو پھر پتا چلے گا کہ وہ کہاں جاتا ہے۔ آج

میں اتفاق سے اس کے اِسکول چلا گیا تو پتا چلا کہ صاحب زادے اب اکثر اسکول سے غائب رہنے لگے ہیں۔"

یہ سُن کر اُس کی امّی کو بھی بڑی حیرت ہوئی۔ اس کے بعد اسلم کے ابّو اپنے کسی کام سے باہر چلے گئے۔ ان کے چلے جانے کے تھوڑی دیر بعد ہی اسلم گھر میں داخل ہوا، کمرے میں جاکر کتابیں میز پر پٹخیں اور باہر آکر امّی سے کھانا مانگنے لگا۔ اُسے دیکھتے ہی اس کی امّی نے پوچھا،

"پہلے یہ بتاؤ کہ تم آج کہاں گئے تھے اور کہاں سے آرہے ہو؟"

اسلم پہلے تو ان سوالوں سے گھبرایا، مگر بعد میں فوراً سنبھل کر بولا،

"کہیں نہیں امّی، میں تو اسکول سے آرہا ہوں۔"

اس کی امّی نے کہا، "اچھا ابھی تمھارے ابّو آکر تمھیں بتائیں گے کہ تم کہاں سے آرہے ہو؟"

اتنا قصّہ سُنا کر نانی اماں کچھ دیر سستانے کے لیے رُک گئیں تو بچّوں نے بے چین ہوکر پوچھنا شروع کیا، "نانی اماں پھر کیا ہوا؟"

نانی اماں پان چباتی ہوئی بولیں، "پھر کیا ہوتا، اَبّو کا نام سنتے ہی اُس کے ہوش اُڑ گئے، کچھ نہیں بولا، خاموشی سے بیٹھک میں جاکر بیٹھ گیا اور ابّو کی مار سے بچنے کی ترکیبیں سوچنے لگا۔ آخر کار گھر سے بھاگنے کا ارادہ کرلیا۔ بچّو! جو بچّے بُری اور گندی عادتوں میں پڑ جاتے ہیں ان کی عقل بھی ختم ہو جاتی ہے۔ اور وہ اپنی بُرائی کو چھُپانے کے لیے غلط راستہ ہی اختیار کرتے ہیں۔ اسلم نے بھی ایسا ہی کیا اور اپنی امّی سے نظریں بچا کر گھر سے بھاگ نکلا اور سیدھے اپنے دوستوں سے جاکر کہنے لگا، "آج تو غضب ہوگیا۔ میرے اَبّو کو سب پتا چل گیا۔ وہ مار مار کر میرا بھُرتا بنادیں گے، اس لیے میں گھر سے بھاگ آیا ہوں۔ میرا ارادہ ہے کہ میں اپنی بہن کے پاس چلا جاؤں، مگر وہ دوسرے شہر میں رہتی ہے۔ تم میری کچھ مدد کرو۔ مجھے ٹکٹ کے لیے پیسوں کی ضرورت ہے۔" سب دوستوں نے کچھ نہ کچھ بہانہ بناکر پیسے دینے سے صاف انکار کردیا اور اسلم سے بولے،

"تو اس میں گھبرانے کی کونسی بات ہے۔ یہ کام تمھارے لیے کونسا مشکل ہے۔ بلا

ٹکٹ سفر کر لو، یہی تو وقت ہے چالاکی اور ہوشیاری دکھانے کا۔"

اسلم ان کی باتوں میں آکر بلا ٹکٹ گاڑی میں سوار ہو گیا اور بچتا بچاتا اپنی بہن کے شہر جا پہنچا۔ اسلم نے جو کافی عرصے کے بعد اس شہر میں آیا تھا، سیدھے اپنی بہن کے گھر جا کر آواز دی۔ گھر میں سے ایک اجنبی شخص نکلا۔ اُس نے آتے ہی اس سے پوچھا،

"تم کون ہو؟ کس سے ملنا چاہتے ہو؟"

اسلم نے کہا، "یہاں میری بہن اور بھائی جان رہتے ہیں۔ ان کا یہ نام ہے۔"

اجنبی نے کہا کہ کچھ عرصہ ہوا، وہ یہ مکان چھوڑ کر کہیں اور چلے گئے جس کا علم نہیں ہے۔

یہ سنتے ہی بچّو! اسلم پر گویا بجلی گر پڑی۔ مایوسی کے عالم میں بوجھل بوجھل قدم اٹھاتا ہوا واپس لوٹ گیا۔ رات کافی ہو چکی تھی۔ بھوک سے بُرا حال ہو رہا تھا۔ سوچنے لگا، یہ تو بہت بُرا ہوا، دھوبی کا کتا گھر کا نہ گھاٹ کا۔ بہن کا گھر کہاں تلاش کروں؟ چلو واپس ہی چلے چلتے ہیں جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ یہ سوچ کر اسٹیشن آیا اور گھر جانے والی گاڑی میں پھر بلا ٹکٹ سوار ہو گیا۔ مصیبت جب آتی ہے تو ہر طرف سے آتی ہے۔ گاڑی ابھی تھوڑی دُور چلی تھی کہ ٹکٹ چیکر ڈبّے میں داخل ہوا۔ اسلم کو اتنا موقع بھی نہ ملا کہ وہ اپنے آپ کو چھپا لیتا۔ اس نے آتے ہی اسلم سے ٹکٹ طلب کیا۔ یہ دیکھ کر وہ بڑا گھبرایا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ٹکٹ چیکر نے کہا، "ٹکٹ نکالو، میں تمھیں ہرگز معاف نہیں کروں گا۔ ایسی سزا دوں گا کہ عمر بھر یاد رکھو گے۔"

یہ کہہ کر اسلم کا کان پکڑ کر بڑی زور کا تھپّڑ رسید کیا۔ اسلم کا سر چکرا گیا۔ اتنے میں گاڑی ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر آ کر رُکی، ٹکٹ چیکر نے اسلم کا ہاتھ پکڑ کر گاڑی سے اُتار دیا۔ اسلم کو آوارہ لڑکا سمجھ کر کسی مسافر نے بھی اس کی مدد نہیں کی۔ اسلم نے بہت منّتیں کیں مگر کچھ نہ ہوا، گاڑی روانہ ہو گئی، اسلم بے بس کھڑا دیکھتا رہا۔ اسٹیشن پر ہر طرف سناٹا تھا کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ صرف ایک لیمپ جل رہا تھا۔ تھک ہار کر لیمپ کے قریب پڑے ہوئے ایک پُرانے بنچ پر جا کر بیٹھ گیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اتنے میں اسے دُور سے دو آدمی اپنی طرف آتے ہوئے نظر آئے۔ اُنھیں دیکھ کر اسلم کی کچھ ڈھارس

بندھی۔ دونوں اجنبی اسلم کے قریب آگئے اور اُسے اکیلا دیکھ کر بولے،
"تم کون ہو اور یہاں کیوں بیٹھے ہو؟"

پہلے تو اسلم ڈرا، لیکن جب انھوں نے تسلّی دی تو اُس نے پوری آپ بیتی سُنا ڈالی۔ معلوم ہے، بچّو! یہ لوگ کون تھے؟ ان لوگوں کا تعلق بچّوں کو اغوا کرنے والے گروہ سے تھا۔ دونوں نے اسلم سے بڑی محبت سے کہا،

"تم بالکل فکر مت کرو، آؤ ہمارے ساتھ چلو، کھانا کھاؤ اور پھر آرام سے سو جاؤ، صبح ہم ٹکٹ لے کر تمھیں گاڑی پر بٹھا دیں گے۔"

مرتا کیا نہ کرتا۔ اسلم ان کے ساتھ روانہ ہوگیا۔ یہ دونوں اسلم کو لے کر اپنے اڈے پر پہنچے جہاں پہرا لگا ہوا تھا۔ اندر بہت سے بچّے موجود تھے جن کے چہروں پر خوف طاری تھا۔
یہ کہہ کر نانی اماں دوسرا پان کھانے کے لیے رُکیں۔ بچّے فوراً بول پڑے،

"پھر کیا ہوا نانی اماں؟"

اس دفعہ نانی اماں نے غصّے میں ڈانٹتے ہوئے بچّوں سے کہا،

"تم لوگوں نے تو ناک میں دم کر رکھا ہے، کچھ دیر تو دم لینے دو۔"

نانی اماں نے پھر دوبارہ قصّہ سنانا شروع کیا:

ہاں، تو پھر یہ ہوا کہ وہی دونوں آدمی جو کچھ دیر پہلے فرشتے بنے ہوئے تھے، شیطان بن گئے۔ ان میں ایک نے گرج دار آواز میں اسلم سے مخاطب ہو کر کہا،

"کان کھول کر سُن لو برخوردار! اب تمھیں ہمیشہ یہیں رہنا پڑے گا۔ جیسا ہم کہیں اُس پر عمل کرنا پڑے گا، خبردار! اگر تم نے یہاں سے بھاگنے یا کسی کو بتانے کی کوشش کی تو یہ خنجر دیکھ لو، اس سے تمھاری گردن اُڑا دی جائے گی۔ جاؤ اور دوسرے

بچّوں کے ساتھ مِل کر سو جاؤ۔"

یہ سُن کر اسلم کے پیروں تلے کی زمین نکل گئی، "اب پچھتاتے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔"

یہ سُن کر سب بچّوں نے نانی اماں سے پوچھا کہ یہ لوگ اِن بچّوں کو پکڑ کر ان کا کیا کرتے ہیں؟ — نانی اماں نے کہا کہ یہ لوگ انھیں پکڑنے کے بعد انھیں ڈرا دھمکا کر اپنی نگرانی میں رکھتے ہیں۔ ان سے بھیک منگواتے ہیں۔ شہر شہر اور گاؤں گاؤں لے کر پھرتے ہیں اور انھیں یتیم بتا کر لوگوں سے بڑی بڑی رقمیں وصول کرتے ہیں۔ بعض دفعہ تو یہ بچّوں کے ہاتھ پیر کاٹ کر انھیں معذور بھی کر دیتے ہیں۔ خدا محفوظ رکھے ہر بچّے کو ان ظالموں سے ——— اسلم دوسرے بچّوں کے ساتھ بھیک مانگتے اور شہر شہر گھومتے گھومتے ایک روز اسی شہر میں جا پہنچا جہاں اس کی بہن رہتی تھی۔ اتفاق سے یہ لوگ جس محلّے میں گئے تھے اُسی میں اسلم کی بہن کا گھر تھا۔ جو لوگ ان بچّوں کے ساتھ تھے انھوں نے ہر بچّے کو الگ الگ گھر میں بھیجا۔ خدا کی قدرت کہ اسلم جس گھر میں بھیک مانگنے گیا وہ اسی کی بہن کا گھر تھا۔ اسلم نے دروازے پر صدا لگائی،

"اماں، خدا کے نام پر ہم یتیموں کی مدد کرو۔"

یہ آواز جیسے ہی اسلم کی بہن کے کانوں میں پہنچی وہ دوڑ کر دروازے پر آئی اور پردے کی اوٹ سے جھانک کر جو دیکھا تو اس کی نظروں کے سامنے خود اُس کا چھوٹا بھائی یتیم کے رُوپ میں کھڑا تھا۔ بہن نے فوراً اس کا ہاتھ پکڑا اور اندر کھینچ لیا۔ اس اچانک واقعہ سے اسلم گھبرا گیا، اس کے مُنھ سے چیخ نکل گئی، مگر جب اس نے دیکھا کہ اسے کھینچنے والی عورت خود اُس کی بہن ہے تو مارے خوشی کے لپٹ گیا۔ بہن اسلم کو اندر کمرے میں لے گئی جہاں اُس کے بھائی جان بھی موجود تھے۔ ان کے پوچھنے پر اسلم نے اپنی پوری رام کہانی سُنا ڈالی۔ اسلم کے بھائی جان کو جب یہ پتا چلا کہ وہ لوگ باہر ہی ہیں تو فوراً نکلے، مگر وہ لوگ اُس وقت سب بچّوں کو لے کر فرار ہو چکے تھے۔ انھوں نے اسلم کی چیخ سُن لی تھی۔ اس کے بعد اسلم کو اُس کے والدین کے پاس پہنچا دیا گیا۔ امّی ابّو اور بیٹا سب مِل کر بڑے خوش ہوئے۔

نونہال ادیب

حمد

محمد اسمٰعیل قمر، سکھر

پیارا پیارا نام ترا ہے
رحمت کرنا کام ترا ہے

دل کا گوشہ گوشہ دیکھا
ہر سُو جلوہ عام ترا ہے

ساری زمیں ہی تیری تابع
چرخِ نیلی فام ترا ہے

کیوں نہ ہمیں ہو جان سے پیارا
سچا بس اِسلام ترا ہے

پوری کرنا سب کی حاجت
کام یہ صبح و شام ترا ہے

رنج نہیں ہے کوئی قمر کو
اس پر یہ اِنعام ترا ہے

نعت

زاھد القمر خان، کوئٹہ

رحمت نے بڑھ کے اس کو گلے سے لگا لیا
جس کو مرے حضورؐ نے دَر پر بلا لیا

اُس آفتابِ نور کے انوار دیکھتے
صحرا کو کائنات کا مرکز بنا لیا

کیا پوچھتے ہو وُسعتِ دامانِ مُصطفےٰ
سائے نے جس کے حشر کا میداں چھپا لیا

یہ انتہائے وصل نصیبِ بشر کہاں
خالق نے اپنے بندے سے پردہ اُٹھا لیا

مختار کائنات کا فیضان کیا کہوں؟
وہ جس نے قُدسیوں کو بھی دَر پر جھکا لیا

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی

محمد یوسف میاں چنوں

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ ۴۷۱ھ میں جیلان نامی ایک بستی میں پیدا ہوئے اور اسی وجہ سے جیلانی کہلاتے ہیں۔ آپ کا نسب دو واسطوں سے حضرت حسن بن حضرت علیؓ سے ملتا ہے۔ آپ اٹھارا سال کی عمر میں بغداد تشریف لے گئے اور وہیں مستقل قیام کیا۔ یہ وہی سال ہے جس میں امام غزالیؒ درسِ نظامی کی تدریس ترک کر کے بغداد سے نکلے۔ آپ عالی ہمتی اور بلند حوصلگی کے ساتھ تحصیلِ علم میں پوری توجہ سے مشغول ہو گئے۔ آپ کو عبادت کا بڑا شوق تھا لیکن اس کے باوجود آپ تحصیل علم میں پوری توجہ سے مشغول ہو گئے۔ آپ نے اپنے زمانے کے باکمال استادوں اور عالموں سے اس وقت کے علوم حاصل کئے اور اُن میں پوری مہارت حاصل کی۔

آپ کے استادوں میں ابوالوفا ابنِ عقیل محمد بن الحسن، الباقلانی اور ابو ذکریا تبریزی جیسے نامور علماء کا نام سرفہرست ہیں۔

علوم کی تکمیل کے بعد آپ نے وعظ اور اصلاحِ معاشرہ کی طرف توجہ دی اور اس کے ساتھ ساتھ لوگوں کو درس دینے کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ اپنے اُستاد شیخ، شیخ مخرمی کے مدرسے میں تدریس و وعظ کا سلسلہ شروع کیا۔ طلبا کی کثرت کی وجہ سے بہت جلد مدرسے میں توسیع کی ضرورت پیش آئی۔ لوگوں کا ہجوم اس قدر بڑھا کہ مدرسے میں تل رکھنے کی جگہ نہ رہی۔ شیخ موافق الدین ابن قدامہ فرماتے ہیں:۔

"میں نے کسی شخص کی آپ سے بڑھ کر دین کی وجہ سے تعظیم ہوتے نہیں دیکھی۔ بادشاہ اور وزرا آپ کی مجلس میں نیازمندی کے ساتھ حاضر ہوتے اور نہایت ادب سے بیٹھ جاتے۔ ایک ایک مجلس میں چار چار سو دواتیں شمار کی گئیں۔ جو لوگ آپ کے ارشاداتِ عالیہ تحریر کرنے لاتے تھے۔ اتنے بلند مرتبے کے باوجود آپ بے حد منکسر تھے۔ کوئی بچہ بھی پکارتا تو کھڑے ہو کر سنتے اور اس کے کام آتے۔ غریبوں اور فقیروں کے ساتھ بیٹھتے، ان کے کپڑے صاف کرتے، لیکن کسی سرکاری عہدے دار اور رکنِ سلطنت کی تعظیم میں ہرگز نہ کھڑے ہوتے۔ خلیفہ کی آمد کی خبر سُن کر قصداً دولت خانے تشریف لے جاتے۔ جب خلیفہ آکر بیٹھ جاتا تو واپس تشریف لاتے تاکہ تعظیماً کھڑا نہ ہونا پڑے۔

آپ کو دیکھنے والے اور ہم عصر آپ کے حُسنِ اخلاق۔ اعلا حوصلے، تواضع و انکسار، سخاوت و ایثار اور اعلا اخلاقی اوصاف کی تعریف کرتے ہیں۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں:

"میں نے حضرت عبدالقادرؒ سے بڑھ کر کوئی خوش اخلاق، فراخ حوصلہ، نرم دل اور تعلقات و محبت کا پاس رکھنے والا نہیں پایا۔ آپ اپنی عظمت

اور عالی مرتبے اور علم کے باوجود سلام میں پہل کرتے، کم زوروں کے پاس بیٹھتے اٹھتے۔ غریبوں کے ساتھ تواضع اور انکساری سے پیش آتے۔

ابن النجار اپنی ایک تاریخ میں آپ کا یہ قول نقل کرتے ہیں:۔

"میں نے تمام اعمال پر غور و فکر کیا ہے اور کھانا کھلانے سے بہتر کوئی عمل نہیں پایا اور نہ عمدہ اور اچھے اخلاق سے افضل کوئی عمل نظر آیا۔ میری یہ خواہش ہے کہ اگر ساری دُنیا میرے قبضے میں آجائے تو اس کی دولت سے بھوکوں کو کھانا کھلا دوں۔"

غُنیَۃ الطالبین اور فتوح الغیب آپ کی مشہور کتابیں ہیں۔ آپ ۱۱ ربیع الثانی ۵۶۲ھ کو اس دُنیا سے رخصت ہو گئے۔

علامہ اقبال

رئیس احمد رئیس، لائل پور

ہم میں سے کون ہے جو اقبال سے واقف نہیں۔ جب بھی اقبال کا نام زبان پر آتا ہے، نگاہیں ادب و احترام سے جھک جاتی ہیں۔ کیوں کہ پاکستان کا خواب سب سے پہلے اقبال ہی نے دیکھا تھا اور یہ خواب قائدِ اعظم محمد علی جناح نے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پورا کیا۔

علامہ اقبال ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو سیال کوٹ میں شیخ نور محمد کے گھر پیدا ہوئے۔ علامہ اقبال کے بزرگوں کا وطن کشمیر تھا۔

اقبال نے ابتدائی تعلیم ایک دینی مدرسے سے حاصل کی۔ اس کے بعد سیال کوٹ کے مشن کالج میں داخل ہو گئے۔ وہاں سے ایف اے کرنے کے بعد بی اے اور ایم اے کے امتحان گورنمنٹ کالج لاہور سے پاس کئے۔ اقبال امتحانوں میں ہمیشہ اچھے نمبروں سے کام یاب ہوتے تھے۔ ایم اے کرنے کے بعد لاہور کے اورنٹیل کالج میں پروفیسر رہے اور پھر ۱۹۰۵ء میں اعلا تعلیم حاصل کرنے کے لیے ولایت چلے گئے۔ ۱۹۰۸ء میں وہاں سے واپس آئے اور وکالت شروع کی۔ ۱۹۲۳ء میں سرکار کی طرف سے سَر کا خطاب ملا۔

اقبال ایک عظیم انسان اور عظیم شاعر تھے۔ وہ قوم کے لیے ایک پیغام لے کر آئے تھے۔ آزادی کا پیغام، محبت اور کوشش اور محنت کا پیغام۔ اتفاق اور اتحاد کا پیغام۔ یہ پیغام انھوں نے بڑے خوب صورت انداز میں پیش۔ انھوں نے ہمارے لیے شعر کہے، غزلیں اور نظمیں لکھیں اور اپنی شاعری میں محبت کا رس گھولا۔ اسی لیے ان کی شاعری میں بے حد اثر ہے۔ وہ جو بات کہتے تھے دل میں اُتر جاتی تھی۔ ان کا ہر شعر آج بھی دِلوں میں جوش اور تڑپ پیدا کرتا ہے۔

اقبال کے دل میں قوم کا درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ وہ اپنی قوم کو ایک طرف انگریزوں کی غلامی میں جکڑا ہوا اور دوسری طرف ہندوؤں کے شکنجے میں

پھنسا ہوا دیکھتے تو ان کا دل درد سے بھر آتا۔ وہ چاہتے تھے کہ قوم ان زنجیروں اور شکنجوں سے آزاد ہو جائے اور دنیا کی دوسری قوموں کی طرح سربلند ہو۔ چناں چہ انھوں نے اپنی پوری زندگی قوم کو سمجھانے اور اسے ترقی کی منزل تک پہنچانے کے لیے وقف کر دی۔ اسی لیے ہم انھیں قومی شاعر کہتے ہیں۔

اقبال کی بہت سی نظمیں ایسی ہیں جو صرف مسلمانوں کے لیے نہیں بلکہ انھوں نے ساری دنیا کے انسانوں کے لیے لکھیں۔ اقبال کو یہ شکایت تھی کہ انسان نے اپنے آپ کو پہچانا نہیں۔ اُن کے خیال میں انسان کے اندر ایک بہت بڑی طاقت ہے۔ اگر انسان اپنی طاقت کو پہچان لے تو پھر یہ کسی کا غلام نہیں رہ سکتا اور نہ یہ کسی کے سامنے جھک سکتا ہے۔ اقبال یہ چاہتے تھے کہ انسان اپنی کوشش اور محنت سے اتنی ترقی کرے کہ دنیا کی باقی تمام چیزیں اس کے قابو میں آجائیں۔ اقبال کی چند مشہور کتابیں بانگِ درا، ضربِ کلیم، پیامِ مشرق اور بالِ جبریل ہیں۔

انھوں نے ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو لاہور میں وفات پائی اور شاہی مسجد کے پہلو میں دفن ہوئے۔ اگر ہم ان کے کلام کو سمجھ لیں اور اس پر عمل پیرا ہوں تو ہمارا مستقبل یقیناً روشن ہوگا۔

کرن

جاوید اقبال، شیخوپورہ

میری کرن ایک گڑیا ہے
سب کے دل کی تمنا ہے
لاکھ تماشے کرتی ہے
سارے گھر کا تماشا ہے
ہر لمحہ مُسکاتی ہے وہ
سب کا دل بہلاتی ہے وہ
اُنگلی ایک اٹھاتی ہے
اللہ ایک بتاتی ہے
گندی کہیے اس کو اگر
آنکھیں خوب دکھاتی ہے
اچھی کہیے اس کو اگر
ہنس کر خوش ہو جاتی ہے
دیکھ کے اپنے ابّا کو
ابّا جھٹ کہہ دیتی ہے
"کرن ہے گندی" کہنے پر
فوراً "ہٹ" کہہ دیتی ہے
نیند جو آنے لگتی ہے
اللہ اللہ کہتی ہے
یعنی اپنے لفظوں میں
لوری گاتی رہتی ہے

شاعرِ ملّی

خرّم شار احمد خان، کراچی

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد مسلمانوں کا آفتاب اقبال غروب ہو چکا تھا۔ برصغیر میں انگریز کا طوطی بول رہا تھا۔ غلامی کا دَور دورہ تھا۔ اخلاقی، تمدنی اور اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی ہر لحاظ سے مُسلمان پست ہو رہے تھے اور وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ تاریکی اور زوال کے یہ سائے بڑھتے ہی جا رہے تھے۔ اس قومی ذلت و پستی نے مُسلمانوں سے اعتقاد اور عمل کی تمام سرگرمیاں چھین لی تھیں۔ اقبال کی ابتدائی تعلیم مکتب سے شروع ہوئی تھی۔ طبیعت میں ذہانت کا خداداد مادّہ تھا۔ علامہ اقبال نے تمام امتحانات امتیازی نمبروں کے ساتھ پاس کیے۔ خوش قسمتی سے سیال کوٹ میں انھیں میر حسن جیسے شفیق، قابل اور مہربان استاد مل گئے ۔ یہ ان کا فیضانِ نظر تھا کہ ڈاکٹر صاحب کی طبیعت میں عربی، فارسی کا صحیح مذاق پیدا کر دیا۔ اقبال نے بی۔اے اور ایم اے کے امتحانات گورنمنٹ کالج لاہور سے پاس کئے اور دونوں میں اِمتیازی پوزیشن حاصل کی۔ علامہ اقبال کی خوش قسمتی سے وہاں پروفیسر آرنلڈ تھے۔ علّامہ اقبال نے فلسفے میں ان سے بے حد اکتساب فیض کیا۔ کچھ عرصے انھوں نے گورنمنٹ کالج اور اورنٹیل کالج لاہور میں بطور پروفیسر کام کیا۔

مگر آرنلڈ کی تعلیم و تربیت اور شفقت نے ڈاکٹر صاحب میں جو علمی ذوق پیدا کیا۔ وہ ابھی نامکمل تھا، چناں چہ وہ اعلا تعلیم کے لیے انگلستان چلے گئے۔ انگلستان میں علامہ اقبال نے بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ محض تین برس کے قیام میں اتنے علمی اعزازات اور ڈگریاں لے کر وہ ۱۹۰۸ء میں واپس وطن لوٹ آئے۔ عجیب بات یہ ہے کہ اقبال یورپ سے اسلام کی سچّائی کے قائل ہو کر لوٹے۔

اقبال کا مقصد شاعری نہ تھا۔ وہ سوئی ہوئی قوم کو بیدار کر کے اس کی مُردہ رگوں میں ایک نئی رُوح پھونکنا چاہتے تھے۔ اس اعتبار سے قدیم و جدید شعرا میں ڈاکٹر صاحب کا موازنہ کسی شاعر سے نہیں کیا جا سکتا۔ وہ بلاشبہ دُنیائے اسلام کے منفرد شاعر تھے۔ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن، ایک ادارہ اور خصوصی مکتبِ فکر سموئے ہوئے تھے۔ حق بات تو یہ ہے کہ ہندو پاک یا ایران کی شاعری کا کوئی درس بھی انھوں نے دوسروں سے مانگے ہوئے خیال و حکمت کے پھولوں سے نہیں سجایا۔ ان کی شاعری کے پیمانے خود ان کی بنائے ہوئے ہیں جس میں وہ عرب کی کھجوروں سے بنا ہوا مشروب پیش کرتے ہیں۔ وہ اگرچہ ہندی نژاد تھے لیکن حجازی لے میں گاتے تھے، چناں چہ کہتے ہیں:

"نغمہ ہندی ہے تو کیا لے تو حجازی ہے مری"

اقبال بجائے خود اقبال ہیں۔ ان کے پیغام نے

برصغیر کے مسلمانوں کو زندگی کا درس دیا، انھیں آمادۂ عمل کیا۔

علامہ اقبال عظیم المرتبت شاعر ہونے کے علاوہ عمدہ نثر نگار بھی تھے۔ انھوں نے اقتصادیات کے بارے میں ایک کتاب "علم الاقتصاد" لکھی تھی۔ اس کے علاوہ ان کے خطوط کے مجموعے بھی مرتب ہو کر شائع ہو چکے ہیں۔ علامہ اقبال کے خطوط دل چسپ اور ان کی شخصیت کے ترجمان ہیں۔ غرض کہ انھوں نے نظم اور نثر دونوں ہی کے ذریعے مسلمانوں کو اپنی اہمیت کو سمجھنے اور اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کرنے پر اُکسایا، انھوں نے نظریہ پاکستان پیش کیا اور اپنی شاعری کے ذریعے اسے حاصل کرنے کا حوصلہ عطا کیا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اقبال کے خیالات اور نظریات صحیح ثابت ہو رہے ہیں، وہ صرف اسلام ہی کو تمام مسلمانوں اور انسانیت کے مسائل کا حل قرار دیتے ہیں۔ ان کی یاد تازہ رکھنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ ہم ان کے خیالات کو دل و جان سے قبول کر کے ایک بار پھر صداقت، شجاعت اور عدالت کا اسلامی درس پڑھیں تاکہ دنیا کی قیادت کی باگ ڈور ہمارے ہاتھوں میں آسکے۔

انصاف کی گھنٹی

سید منصور طارق زیدی، کراچی

بہت زمانہ گزرا، کسی ملک میں ایک بادشاہ حکمراں

تھا۔ وہ بہت رحم دل اور انصاف پسند تھا۔ اسے اپنی رعایا کی خوش حالی اور بھلائی کا ہر وقت خیال رہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی پر ظلم اور زیادتی نہ ہو۔

اپنی رعایا کے ہر شخص کے ساتھ انصاف کرنے کے لیے بادشاہ نے دارالحکومت کے سب سے بڑے چوک میں (جس کو بعد میں انصاف چوک کے نام سے پکارا جانے لگا) ایک اونچا سا مینار تعمیر کروایا اور مینار کی برجی میں ایک بڑی گھنٹی نصب کرائی۔ گھنٹی میں ایک مضبوط ڈوری باندھ کر نیچے لٹکا دی۔ ڈوری اتنی لمبی تھی کہ ایک چھوٹا بچہ بھی کھینچ کر گھنٹی بجا سکتا تھا۔ اس نے لوگوں کی فریاد سننے اور انصاف کرنے کے لیے خصوصی عملہ مقرر کیا، تاکہ بلا تاخیر فیصلہ کیا جا سکے۔ بادشاہ نے ملک بھر میں منادی کرا دی کہ جس کسی شخص پر کسی نے ظلم کیا ہو یا کسی کے ساتھ زیادتی ہوئی ہو وہ دارالحکومت پہنچ کر انصاف چوک میں نصب شدہ گھنٹی بجائے۔ اس کی فریاد فوری سُنی جائے گی اور بلا تاخیر انصاف کیا جائے گا۔

عرصۂ دراز تک انصاف چوک کے اونچے مینار میں گھنٹی لٹکی رہی۔ مظلوم اور ضرورت مند لوگوں نے جب بھی یہ گھنٹی بجائی اور جس نے بھی فریاد کی تلا تاخیر اور بغیر کسی امتیاز کے اس کے ساتھ انصاف کیا گیا۔

وقت گزرتا گیا اور استعمال ہوتے ہوتے گھنٹی

کی ڈوری پرانی اور بوسیدہ ہو کر ٹوٹ گئی۔ اتفاق سے دوسری ڈوری فوری طور پر دست یاب نہ ہو سکی۔ بادشاہ نے جلد ہی ایک مضبوط اور کافی لمبی ڈوری فراہم کرنے کا حکم دیا۔

لوگوں نے سوچا کہ اِس عرصے میں اگر کوئی فریادی آئے اور اُسے مدد اور انصاف کی ضرورت ہو تو کیا ہوگا؟ ایسا بندوبست کرنا چاہیئے کہ کوئی فریادی بغیر انصاف حاصل کیے مایوس و ناکام نہ واپس ہو، چناں چہ انھوں نے انگور کی ایک لمبی بیل گھنٹی میں باندھ کر نیچے لٹکا دی۔ یہ واقعہ موسمِ بہار میں پیش آیا، اس لیے انگور کی بیل میں کچھ ہی دنوں بعد ہری ہری کونپلیں اور ننھی ننھی پتیاں نکلنا شروع ہو گئیں۔

دارالحکومت میں ایک بوڑھا مال دار فوجی سردار بھی رہتا تھا۔ اس کے پاس ایک گھوڑا تھا جو بہت سی لڑائیوں میں اس کے ساتھ شریک رہا تھا لیکن اب وہ بوڑھا ہو گیا تھا اور ٹانگ میں پرانی چوٹ کے باعث لنگڑا کر چلنے لگا تھا۔ گھوڑا اب کسی کام کے قابل نہ تھا، اس لیے اس کے بے رحم مالک، فوجی سردار نے اس کو گلیوں میں آوارہ چھوڑ دیا تھا تاکہ وہ خود اپنی بساط بھر خوراک اپنے لیے حاصل کر سکے۔ بے چارہ بوڑھا گھوڑا لنگڑاتا گلیوں میں پھرتا تھا اور جہاں کہیں جو کچھ میسّر آجاتا اس سے شکم پُری کر لیتا۔ بعض اوقات اس کو لوگوں کے ڈنڈے بھی کھانے پڑتے تھے، وہ روز بروز کم زور اور ناتواں ہوتا جا رہا تھا۔

پھرتے پھرتے ایک روز بوڑھا گھوڑا انصاف چوک میں جا نکلا۔ مینار کے قریب سے گزرا تو انگور کی بیل میں ہری ہری کونپلیں اور پتیاں دیکھ کر رُک گیا۔ بھوک ناقابلِ برداشت تھی اس لیے بیل کو منھ میں لے کر زور سے کھینچا۔ "ٹن ٹن ٹن ٹن!" پورا شہر گھنٹی کی آواز سے گونج اٹھا۔ کون فریادی اِنصاف کے لیے گھنٹی بجا رہا ہے؟ لوگ انصاف چوک کی طرف دوڑے۔ دیکھتے ہی دیکھتے لوگوں کا اژدہام (ہجوم) انصاف چوک میں جمع ہو گیا۔ بادشاہ کے مقرر کردہ مخصوص جج بھی دوڑتے ہوئے مینار کے قریب اپنے دفتر میں پہنچ گئے۔

"یہ بوڑھا گھوڑا کس کا ہے؟" ججوں نے لوگوں سے دریافت کیا۔ مجمعے میں سے کئی آدمیوں نے بوڑھے اور کم زور گھوڑے کی سرگزشت بیان کی۔ ججوں نے گھوڑے کے بے رحم مالک کو فوراً طلب کیا اور اس کو حکم دیا کہ وہ گھوڑے کے لیے ایک اچھا اور آرام دہ اصطبل بنائے اور اپنے وفادار گھوڑے کو، جب تک وہ زندہ رہے اچھا چارہ اور دانہ کھلاتا رہے ورنہ حکم نہ ماننے کی صورت میں کُل جائداد ضبط کر لی جائے گی۔ لوگ اس فیصلے کو سُن کر جوش سے نعرے لگاتے اپنے اپنے گھروں کو لوٹے اور بے رحم بوڑھا سردار شرم سے اپنا سر

جھکائے گھوڑے کو اپنے ساتھ لے گیا۔

منّو میاں

عبدالسمیع بلوچ۔ کراچی

بڑے بھولے بھالے ہیں منّو میاں
دلوں کے اُجالے ہیں منّو میاں

کبھی گندے بچّوں میں جاتے نہیں
کبھی یہ کسی کو ستاتے نہیں

شرارت سے ان کو نہیں کوئی کام
وہ کرتے ہیں سب کو ادب سے سلام

کبھی اپنی بہنوں سے لڑتے نہیں
کبھی بھائیوں سے جھگڑتے نہیں

پڑھائی میں بھی دل لگاتے ہیں وہ
کہانی بھی سب کو سُناتے ہیں وہ

سبھی ان کو رکھتے ہیں دل سے عزیز
سبھی ان کو لا لا کے دیتے ہیں چیز

بڑے بھولے بھالے ہیں منّو میاں

ہم نے فلم دیکھی

جاوید حسن علی بگیوں، حیدرآباد

ایک دن ہم نے گھر والوں کی چوری سے فلم دیکھنے کا پروگرام بنایا اور اپنے ایک دوست کے ساتھ ٹکٹ لے کر سینما گھر میں گھس گئے، فلم مزاحیہ تھی، اُس پر آزادی کا احساس، ہم دل کھول کر قہقہہ لگانے لگے۔ اتنے میں ہمارے دوست نے کہا،

"بھئی جاوید، تم یہیں بیٹھو میں کیک لے کر ابھی آتا ہوں۔" ہم ذرا گھبرائے اور بولے،

"دیکھو دوست، ذرا جلدی آنا۔"

وہ چلا گیا تو تھوڑی دیر ہم سہمے رہے، کیوں کہ پہلی بار چوری سے فلم دیکھنے آئے تھے اور دوست کی موجودگی سے ہمت بڑھی ہوئی تھی۔ بہرحال فلم چلتی رہی اور ہمیں پتا بھی نہیں چلا کہ وہ کب آیا۔ فلم کے دوران قہقہے روک کر ہم نے کہا،

"الگ الگ ہی کھا رہے ہو، ہمارا حصّہ بھی تو دو۔" اندھیرے میں کوئی چیز ہمارے ہاتھ میں تھما دی گئی۔ منھ میں جو رکھا تو پتا چلا کہ کیک کے بجائے سموسہ ہے۔ خیر ہم سمجھے چلو کیک نہیں ملا ہوگا، کیا حرج ہے۔ مفت کا سموسہ بھی کوئی بُری چیز نہیں ہے۔

اتنے میں پردے پر ایک ایسا مزاحیہ سین آیا کہ ہم ہنسی کے مارے دوہرے ہو گئے اور جوش میں ہم نے اپنے دوست کو کس کر ایک عدد ایسی دھول رسید کی کہ بے چارے کی چیخ نکل گئی۔ ہم نے تھوڑی دیر کے لیے سوچا کہ کم بخت کی آواز کیوں بدل گئی ہے، لیکن پھر یہی خیال آیا کہ اس وقت شاید اس کے منھ میں کچھ ہوگا۔ غرض فلم کے دوران مسلسل ہم اس کی پٹائی کرتے رہے اور ہنس ہنس کر اپنا وقت گزارا کیے۔ آخر فلم ختم ہوگئی اور روشنیاں کھل گئیں۔ اب جو مُڑ کر دیکھا تو پیروں تلے کی زمین نکل گئی۔ ساتھ

والی سیٹ پر حساب کے ماسٹر صاحب لال لال دیدے نکالے گھور رہے تھے۔ یہ منظر دیکھتے ہی ہم چھلانگ لگا کر مجمعے میں سے نکل بھاگے۔ صبح ماسٹر صاحب نے تمام لڑکوں کو ہمارا تماشا دکھایا، جی ہاں! ٹکٹ کے بغیر۔

برونئی

ملک آفتاب احمد مالنری، کراچی

جنوب مشرقی ایشیا میں اب صرف ایک ہی بادشاہ رہ گیا ہے۔ اور وہ ہے سلطان برونئی۔ ان کا نام حسن معیز الدین ہے اور وہ اپنے خاندان کے ۲۹ ویں سلطان ہیں۔ یہ ملائشیا کے جزیرے بورنیو کے ساحل پر ایک چھوٹی سی بادشاہت ہے۔ برونئی کا رقبہ ہے ۲،۲۲۶ مربع میل اور آبادی ۸۰۰۰۰ نفوس پر مشتمل ہے۔ اس ملک میں ۷۵ فی صد مسلمان ہیں۔ سرکاری زبان انگریزی ہے۔ یہ ملک ۲۸ ستمبر ۱۹۵۹ء کو آزاد ہوا۔

برونئی کی معلوم تاریخ کا آغاز ابتدائی سولہویں صدی میں ہوتا ہے۔ اس زمانے میں یہ مملکت تمام جزیرہ بورنیو اور مجمع الجزائر مالے پر مشتمل تھی۔ انیسویں صدی میں ولندیزی اور انگریزی سامراجی طاقتوں نے اس کے وسیع علاقے پر قبضہ کر لیا تھا۔

برونئی کی معیشت کی بنیاد تیل کی پیداوار ہے جس کی پہلی کھدائی ۱۹۲۹ء میں ہوئی۔ اس کے علاوہ ربڑ، زراعت، ماہی گیری اور جنگلات پر بھی معیشت کا دارومدار ہے۔ برونئی میں ۷۹ میل لمبی سڑکیں اور ایک مختصر ریلوے لائن ہے۔ مئی ۱۹۵۷ء سے برونئی براڈ کاسٹنگ سروس سے نشریات بھی شروع ہوگئی ہیں۔ سرکاری ہسپتال اور دواخانے عوام کی صحت کی دیکھ بھال مفت کرتے ہیں۔ یہاں تنخواہیں ایشیا کے ہر ملک سے زیادہ ہیں۔ اور کوئی انکم ٹیکس نہیں ہے۔ شراب پر پابندی ہے۔ یہاں جنوب مشرقی ایشیا کا سب سے بڑا رن وے ہے۔

موجودہ سلطان کے والد عمر علی سیف الدین اکتوبر ۱۹۶۸ء میں تخت سے دست بردار ہوئے لیکن دست برداری کے باوجود وہ برونئی کی مقتدر ترین شخصیت ہیں۔

لباس کی بات

محمد سلیم ملک۔ میرپور خاص

مُلّا نصر الدین کا ایک بہت پُرانا دوست جلال ایک دن مُلّا کے ہاں آیا۔ مُلّا نے کہا "اتنے عرصے بعد تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ میں ابھی کچھ لوگوں سے ملنے کے لیے جانے ہی والا تھا۔ تم بھی میرے ساتھ چلو۔" جلال نے کہا:

"پھر مجھے کوئی اچھا سا لباس کچھ دیر کے لیے دے دو، کیوں کہ میرے یہ کپڑے ملاقاتوں کے لیے کچھ ٹھیک نہیں ہیں۔ مُلّا نے بہت نفیس لباس پہننے کو دیا اور پھر اسے ساتھ لے کر لوگوں سے ملنے

نکل گئے۔ پہلے شخص سے انھوں نے اپنے دوست کا تعارف یوں کرایا، "یہ میرے پُرانے دوست جلال ہیں، لیکن انھوں نے جو لباس پہنا ہوا ہے وہ میرا ہے۔" وہاں سے نکلے تو راستے میں جلال نے مُلّا سے کہا، "مُلّا، یہ کیا حماقت ہے کہ، یہ لباس میرا ہے، اب یہ بات پھر نہ کہنا۔ مُلّا کو جس دوسرے شخص سے مِلنا تھا۔ اس کے گھر میں جب آرام سے بیٹھ گئے تو نصرالدین نے کہا، "یہ میرے پُرانے دوست جلال ہیں، مجھ ملنے آئے تھے، لیکن یہ لباس ..... ہاں یہ بھی انہی کا ہے۔" وہاں سے چلے تو جلال اس فقرے پر بھی برہم ہوا، "آخر تم لباس کا ذکر کیوں بیچ میں لے بیٹھتے ہو؟ کیا یہ اتنا ہی ضروری ہے؟"

ملا نے کہا "میں نے بات بدل تو لی ہے۔"

جلال نے پھر اصرار کیا، "اگر تم بُرا نہ مانو.....

تو میرے خیال میں میرے لباس کے بارے میں کوئی بات سرے سے ہی نہ کی جائے۔" تیسری اور آخری ملاقات میں نصرالدین نے کہا، "اِن سے ملیئے، یہ میرے دوست جلال ہیں اور یہ جو لباس پہنے ہوئے ہیں ہمیں اس کے بارے میں کوئی بات نہیں کرنی ہے۔"

دو معاہدے

جمیل الرحمان طاہر کمالوالا، سیالکوٹ

میثاق استنبول: علاقائی تعاون برائے ترقی کے اس معاہدے پر جولائی ۱۹۶۴ء میں استنبول میں دستخط ہوئے تھے۔ اس معاہدے کے رُکن ملک پاکستان، ترکی اور ایران ہیں۔ میثاق استنبول کا مقصد ان تینوں ملکوں کا آپس میں اقتصادی تعاون مِل جُل کر مشترکہ سرمائے سے صنعتیں قائم کرنا اور ایک دوسرے کو اقتصادی ترقی میں مدد دینا ہے۔ اس معاہدے سے تین مُسلمان ملکوں کے دوستانہ تعلقات مزید گہرے ہو گئے۔

نیٹو: (معاہدۂ شمالی اوقیانوس) یہ یورپی طاقتوں کا رُوس کے خلاف ایک محاذ ہے۔ یہ معاہدہ اپریل ۱۹۴۹ء میں ہوا تھا۔ اس کے ممبر ملک امریکا، برطانیہ، کینیڈا، فرانس، ہالینڈ، بلجیم، لکسمبرگ، اٹلی، ڈنمارک، ناروے، آئس لینڈ، پرتگال ترکی اور یونان ہیں۔

گیلیلیو

علی رضا خان، کراچی

آیئے! آج ہم آپ کو ایک مشہور ماہرِ فلکیات اور فلسفی کے بارے میں کچھ بتائیں۔ جب انسان پیدا ہوتا ہے تو کسی کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ بڑا ہو کر کیا بنے گا۔ وہ دُنیا میں اپنا مقام خود اپنی کوشش سے حاصل کرتا ہے۔ ناکامی کی صورت میں کسی بھی انسان کو ہمت نہیں ہارنی چاہیے، بلکہ کوشش جاری رکھنی چاہیے۔ سر فرانسس ڈریک، نیوٹن، بنجمن فرینکلن، کرسٹوفر کولمبس،

ڈارون، ایڈیسن اور روتنجن جو بڑے بڑے ریاضی دان، فلسفی اور سائنس داں تھے۔ ان سب نے اپنے مقام کے لیے کوشش کی اور آخر کار وہ مقام پا لیا اور ہم ان کو آج بھی یاد کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے۔

گیلیلیو اٹلی کے شہر پیسا میں پیدا ہوا۔ پیسا یونی ورسٹی سے ڈگری لینے کے بعد وہیں پروفیسر مقرر ہوا۔ گیلیلیو پہلا شخص تھا۔ جس نے یہ ثابت کر دکھایا کہ بھاری اور ہلکی چیز ایک ساتھ گرتی ہے۔ گیلیلیو نے کوپرنیکس کے اس نظریئے کی حمایت کی کہ سورج مرکز ہے اور ستارے اس کے گرد گھومتے ہیں اس پر اس وقت کے یورپی علماء ناراض ہو گئے اور اُسے عمر کا آخری حصہ جیل میں گزارنا پڑا۔

گیلیلیو کا سب سے بڑا کارنامہ دُوربین کی ایجاد ہے جو اُس نے ۱۶۰۹ء میں ایجاد کی۔ اس دوربین کے ذریعے ہی اس نے چاند کے غاروں اور سورج کے دھبّوں کا پتا چلایا اور کہکشاں کا سُراغ بھی اس کی دُوربین سے ہی لگا۔ ایک عظیم سائنس دان کا اس سے بڑا کوئی انعام نہیں کہ اس کے کارنامے اور اس کے نام کو تا قیامت یاد رکھا جائے۔ اس عظیم سائنس دان کی وفات ۱۶۴۲ء میں ہوئی۔

آیئے! عہد کریں کہ ہم بھی کوئی کارنامہ انجام دیں گے تاکہ ہمارے ملک و قوم کی عزت ہو اور ہمارا نام دنیا میں زندہ رہے۔

شارک مچھلی کی کھال

محمد قمر، کراچی

شارک مچھلی کو دُنیا کے مختلف ملکوں میں بے شمار طریقوں سے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کی کھال بھی نہایت سخت اور مضبوط ہوتی ہے، اس کی زرہیں اور خول آسانی سے بنائے جاتے ہیں۔ شارک کے دانتوں کو دستانوں کے اوپر لگا دیا جاتا ہے اور یہ دستانے دُشمن سے مقابلے کے وقت پہن لیئے جاتے ہیں۔ یہ دانت قدرتی طور پر ریزر بلیڈ کی مانند تیز اور فولاد کی طرح سخت ہوتے ہیں اور ان کا گھاؤ جان لیوا ثابت ہوتا ہے۔ چناں چہ قدیم زمانے کے لوگوں کے جنگی ہتھیار جو اب تک پائے گئے ہیں ان میں شارک مچھلی کی کھال سے بنی ہوئی زرہیں، سر پر پہننے کے خود اور دستانے شامل ہیں۔ اس کی کھال تلواروں، کلھاڑیوں، نیزوں اور خنجر کے دستوں پر بھی مَنڈھی جاتی ہے تاکہ کھردرے پن کے باعث ہاتھ کی گرفت مضبوط رہ سکے۔ تلواروں کے دستوں پر شارک کھال چڑھانے کا رواج عام تھا۔ پہلی جنگِ عظیم کے خاتمے تک یہ حال تھا کہ جرمنی میں شارک کی اتنی کھالیں فروخت کے لیے عالمی منڈی میں

بھیجی گئیں جو تیس ہزار تلواروں کے دستوں میں لگانے کے کام آسکتی تھیں۔ اس کھال کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ کھردری لکڑی کو نہایت صاف و شفاف بنانے کے لیے اِسے ریگ مال کی جگہ استعمال کرتے ہیں۔ متواتر استعمال کے بعد بھی یہ اپنی حالت پر قائم رہتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شارک کی کھال کے اوپر ہڈی کے بے شمار باریک اور نوکیلے دانے دانے سے اُبھرے رہتے ہیں۔ یہ دانے دراصل ایک قسم کے دانت ہی ہوتے ہیں۔ شارک کی کھال بھی عام مچھلیوں کی نسبت ذرا موٹی ہوتی ہے۔ لکڑی پر اگر یہ کھال رگڑ دی جائے تو وہ شیشے کی مانند چمکنے لگ جاتی ہے۔

مچھلی پکڑنے والے مشہور عالم انگریز شکاری کیپٹن ولیم۔ ای ینگ اپنی کتاب میں ایک دلچسپ واقعہ لکھتے ہیں:

"ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ یکے بعد دیگرے میں نے سات شارک مچھلیاں پکڑیں اور انھیں خالی کشتی کے اندر پھینک دیا۔ وہ دیر تک اُچھلتی اور تڑپتی رہیں۔ کنارے پر آکر جب میں نے اُن مچھلیوں کو باہر نکالا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ کشتی کے اندر کی وہ تمام جگہ جہاں یہ مچھلیاں تڑپ تڑپ کر اِدھر سے اُدھر اُچھلتی رہی تھیں ایسی ہوگئی تھی جیسے کسی بڑھئی نے اس پر ریگ مال پھیر دیا ہو۔ رنگ و روغن سب اُڑ چکا تھا۔ اور نیچے سے لکڑی صاف و شفاف ہوکر شیشے کی طرح چمک رہی تھی۔"

شارک کی کھال کا سب سے زیادہ حیران کن استعمال اس کے بٹوے بنانے میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہ بٹوے "جیب تراش پروف" کہلاتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ اس کی کھال کے بنے ہوئے بٹوے کو ماہر جیب تراش بھی نہیں نکال سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جوں ہی کوئی شخص جیب میں انگلیاں ڈال کر بٹوہ اُڑانے کی کوشش کرتا ہے، کھال کے اوپر لگے ہوئے باریک دانت جیب کے استر میں کانٹوں کی طرح پھنس جاتے ہیں اور بٹوہ باہر نہیں نکل سکتا۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اس بٹوے کو ریزر بلیڈ یا قینچی سے بھی آسانی سے نہیں کاٹا جا سکتا۔ چناں چہ یورپ اور امریکا میں شارک کی کھال سے بنے ہوئے بٹوے بہت استعمال ہو رہے ہیں اور جیب کتروں کے لیے خاصی پریشانی کے باعث بن رہے ہیں۔ ان بٹوؤں کے مالکوں کو بھی جیب سے بٹوہ نکالنے کے لیے پہلے خاصی مشق کرنی پڑتی ہے اور انھیں یہ بٹوہ اتنی احتیاط سے نکالنا پڑتا ہے کہ بٹوے میں لگے ہوئے دانت کپڑوں کو چھونے نہ پائیں۔

پیاری بلی

شیدائے شفیق، کراچی

کالی کالی بلی آئی
بھولی بھالی بلی آئی

کس تیزی سے چلتی ہے یہ
میاؤں میاؤں کرتی ہے یہ
پیار سے سب ہی اس کو بلائیں
گود میں اپنے لا کے بٹھائیں

دُم کو یہ اپنے خوب ہلائے
اُچھلے کودے، کھیل دکھائے
پیار سے سب کہتے ہیں پُوسی
اس کی ہے اک سہیلی تُوسی

اِن دونوں کا شوق نرالا
کھیل یہ کھیلے آلا پالا
چوہے اس کو دیکھ کے بھاگے
پوسی جب بھی سو کر جاگے

دیکھو اس کی مالکن آئی
ہاتھ میں اس کے دودھ ملائی

دَوران خون

شبانہ عصمت، پشاور

جیسا کہ ہم جانتے ہیں غذا ہضم ہونے کے بعد رگوں کے ذریعے جزوِ بدن ہوتی ہے، یعنی رگوں سے خون میں داخل ہوتی ہے اور خون بدن میں گردش کرتا ہے۔ جہاں یہ بدن پھٹا ہوا یا سخت زخمی ہو وہاں سے خون باہر نکلتا ہے۔ گردش کے دوران خون جذب شدہ غذا کو بدن کے تمام حصّوں میں پہنچاتا ہے اور حرارت کو بھی بدن کے تمام حصوں میں یکساں رکھتا ہے۔ اگر کسی عضو میں خون نہ پہنچے تو وہ عضو غذا نہ ملنے کی وجہ سے نکما (ناکارہ) ہو جاتا ہے۔ مثلاً آنکھیں دیکھتی نہیں ہیں۔ کان سنتے نہیں ہیں۔ ہاتھ پاؤں حرکت نہیں کرتے۔ دل خون کی گردش کے کارخانے کا مرکز ہے۔ دل خون کو خاص دباؤ کے ساتھ بڑی اور نازک رگوں میں جاری رکھتا ہے۔

جانوروں پر رحم

شہباز احمد جوئیہ، گوجرانوالا

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں بار بار رحم کی تاکید فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ جو بھی زمین پر ہیں ان پر رحم کرو۔ اللہ تعالیٰ نے رحم کرنے والوں کو بہت بڑا رتبہ عطا فرمایا ہے۔ خدا تعالے نے انسانوں کی نسبت دوسری مخلوق یعنی چرند، پرند اور حیوانات پر بھی رحم کی بار بار تاکید فرمائی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ اِرْحَمُوْا مَنْ فِی الْاَرْضِ یَرْحَمْکُمْ مَنْ فِی السَّمَاءِ۔ یعنی:

کرو مہربانی تم اہلِ زمیں پر ۔:۔ خدا مہرباں ہوگا عرشِ بریں پر

حدیثِ پاک میں اہلِ زمین سے مُراد صرف انسان ہی نہیں بلکہ تمام مخلوق ہے اور تمام پر رحم و کرم کرنے کا حکم ہے۔

ایک دفعہ ایک بزرگ کو دورانِ سفر پیاس کی شدّت نے سخت بے تاب کیا۔ اتّفاق سے پاس ہی ایک کنواں تھا۔ آپ جب پانی پینے لگے تو دیکھا کہ ایک کتا کنوئیں کی نم آلود مٹی چاٹ رہا ہے اور پیاس کی شدّت سے سخت بے چین ہے۔ آپ کنوئیں میں اترے اور اپنے موزے میں پانی بھر کر اُسے پانی پلایا۔ جانوروں پر رحم کرنے سے صرف خدا تعالیٰ ہی خوش نہیں ہوتے بلکہ جانور بھی اس کا بدلہ ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔۔۔ ایک امریکی سیاح لکھتا ہے :-

"میں سیر کرنے کے لیے ضروری سامان لے کر گھر سے نکلا۔ جنگلوں میں گھومتے گھماتے خوراک ختم ہوگئی اور میں راستہ بھٹک گیا۔ پیاس نے سخت تنگ کر رکھا تھا۔ میں ایک درخت کے سائے کے نیچے بیٹھ گیا۔ اتنے میں ایک بندر کے کراہنے کی آواز آنے لگی۔ میں وہاں پہنچا تو دیکھا کہ اُس کے پاؤں میں شیشہ چبھا ہوا ہے میں نے شیشہ نکالا اور بڑے آرام سے اُس پر پٹی باندھ دی۔ میں دو تین دن تک اس کی مرہم پٹی کے لیے وہیں ٹھہرا۔ دوسرے دن اس کے درد میں کافی افاقہ ہوگیا تھا۔ مجھے پیاس سے سخت پریشان دیکھ کر وہ بتائے بغیر ہی چلا گیا۔ کچھ دیر بعد کیا دیکھتا ہوں کہ وہی بندر ہاتھ میں دو ناریل لیے چلا آرہا ہے۔ میں نے ناریل توڑا اور اپنی پیاس بجھائی۔ جب وہ بالکل ٹھیک ہوگیا تو میں نے وہاں سے جانے کا ارادہ کیا، لیکن وہ بھی میرے ساتھ ہو لیا میں حیران تھا کہ جانوروں میں بھی ایسا جذبہ ہوتا ہے کہ وہ احسان کا بدلہ ادا کریں۔"

غریب لڑکا

تہمینہ ساجدہ، راولپنڈی

کسی گاؤں میں ایک یتیم لڑکا رہتا تھا اور روٹی پیسے کے لیے گاؤں کے ہر دروازے پر دستک دیتا اور ہر دروازے سے مایوس ہو کر واپس آجاتا جب وہ واپس اسی جھونپڑی میں جاتا تو اس کو اپنے ماں باپ بہت یاد آتے۔ اسی گاؤں میں اس کا چچا بھی رہتا تھا۔ اس کے بیوی بچّے اس کا بہت مذاق اُڑاتے تھے۔ وہ جب کبھی ان کے گھر جاتا تو وہ اسے دھکّے دے کر نکال دیتے۔ ایک دن اس کے چچا کے گھر چوری ہوگئی۔ اس کے چچا نے کہا یہ چوری اسی لڑکے نے کی ہے۔ آخر کار اس کے چچا نے پولیس میں رپورٹ لکھائی۔ بڑی چھان بین کے بعد پولیس

نے چور کو ڈھونڈ نکالا۔ مار پیٹ کرنے کے بعد چور نے سب کچھ بتا دیا۔ اس کے چچا نے اُس سے معافی مانگی۔ لڑکے نے اپنے چچا کو معاف کر دیا۔ چچا نے لڑکے سے کہا، "بیٹا، تم میرے پاس رہو اور جو ہم کھاتے ہیں تم بھی کھاؤ۔"

لڑکے نے کہا، "شکریہ، میری قسمت میں جو روکھی سوکھی ہے وہی میرے لیے کافی ہے۔"

لڑکا کافی عرصے سے سوچ رہا تھا کہ اگر کہیں نوکری مل جائے تو وقت اچھا گزر سکتا ہے۔ ایک دن وہ نوکری کی تلاش میں پھر رہا تھا کہ اسے ایک بوڑھا آدمی ملا۔ اس نے لڑکے سے پوچھا کہ "تم کہاں جا رہے ہو؟" لڑکے نے اُسے سب کچھ بتا دیا۔ بوڑھے آدمی نے کہا، "مجھے پیاس لگی ہے، پانی پلا دو۔" لڑکا بوڑھے آدمی کو اپنے ساتھ جھونپڑے میں لے گیا اور اس کی خوب خدمت کی وہ بوڑھا آدمی لڑکے کے سلوک سے بہت خوش ہوا اور اسے دعائیں دیتا ہوا ایک طرف چل دیا۔ اگلے دن صبح جب وہ سو کر اٹھا تو اُسے اپنے تکیے کے نیچے ایک تھیلی ملی جس میں بہت سے پیسے پڑے ہوئے تھے۔ وہ یہ دیکھ ہی رہا تھا کہ اس کی نظر سامنے پڑے ہوئے ایک پرچے پر پڑی۔ اُس نے اٹھا کر پڑھا تو لکھا تھا:

"ہمیشہ بڑوں کی خدمت کیا کرو، اس کا صلہ تمھیں ضرور ملے گا۔"

پھر وہ گاؤں کا امیر ترین شخص بن گیا۔ اور ہمیشہ بزرگوں کی خدمت اور یتیم بچوں سے پیار کرتا رہا۔

ڈاکٹر شیخ محمد اقبال

نسیم احمد نسیم، کراچی

شاعرِ مشرق ڈاکٹر سر شیخ محمد اقبال اردو کے

ان چند شاعروں میں سے ہیں جنھیں زندگی ہی میں دائمی شہرت حاصل ہو گئی تھی۔ علامہ اقبال جمعہ ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو سیال کوٹ میں پیدا ہوئے۔ انھیں شعر و شاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ ان کی ابتدائی تعلیم مکتب میں ہوئی، پھر جب انگریزی تعلیم کے لیے اسکاچ مشن ہائی اسکول میں داخل ہوئے تو خوش قسمتی سے اُنھیں مولانا میر حسن جیسے شفیق اور قابل استاد مل گئے۔ اقبال نے اسکاچ مشن کالج سیال کوٹ سے ایف اے کا امتحان پاس کیا۔ پھر گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوئے اور فلسفے کو اپنا اختیاری مضمون منتخب کیا۔ فلسفے کے استاد پروفیسر آرنلڈ تھے۔ انھی کی صحبت میں اقبال کے فلسفیانہ ذہن کی تعمیر ہوئی۔ فلسفے سے ان کے گہرے تعلق نے اردو کو ایک مفکر شاعر عطا کیا۔ گورنمنٹ کالج سے بی اے کرنے کے بعد اقبال نے ۱۸۹۹ء میں پنجاب یونی ورسٹی سے ایم اے کیا

اور پھر کچھ عرصے اورینٹل کالج لاہور میں فلسفہ اور تاریخ۔ اور انگریزی کے پروفیسر رہے۔ ۱۹۰۵ء میں وہ اعلا تعلیم کے لیے یورپ تشریف لے گئے۔ وہاں کیمبرج یونی ورسٹی سے فلسفۂ اخلاق کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد پھر جرمنی جاکر میونخ یونی ورسٹی سے ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری حاصل کی۔ ان ہی دنوں وہ بیرسٹر بھی ہوگئے اور عارضی طور پر عربی پروفیسر کی حیثیت سے لندن یونی ورسٹی میں ڈاکٹر آرنلڈ کی قائم مقامی بھی کی۔ ۱۹۰۸ء میں واپس آگئے اور کچھ عرصے گورنمنٹ کالج میں ملازمت کی اس کے بعد وکالت شروع کر دی۔ یہ سلسلہ ۱۹۳۴ء تک جاری رہا۔ ۱۹۲۳ء میں سرکار برطانیہ نے ڈاکٹر اقبال کو سر کا خطاب دیا۔ دسمبر ۱۹۲۶ء میں پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے الیکشن میں کام یاب ہوئے۔ ۱۹۳۰ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے الہ آباد کے اجلاس میں وہ تاریخی خطبہ دیا جس میں ہندوستان کی مشکلات کا حل پاکستان کے قیام کی تجویز کی صورت میں پیش کیا۔ ۱۹۳۱ء میں لندن گول میز کانفرنس میں شرکت کی۔ دنیائے علم و ادب اور عالمِ اسلام کا یہ روشن آفتاب جمعرات ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو غروب ہوگیا۔ اُن کے جسدِ خاکی کو لاہور کی بادشاہی مسجد کے پہلو میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔

دوست بنیے اور بنائیے

اُمِّ سلمہ، کراچی

انسان ہمیشہ سے ایک دوسرے کا محتاج ہے۔ دوست بھی ایک نعمت ہوتا ہے۔ انسان چاہے کتنا ہی بد دماغ اور بدمزاج ہو، اگر آپ اس کی پسند کو مدِنظر رکھتے ہوئے اس سے میٹھے لہجے میں گفت و شنید کریں تو اس کی طبیعت آپ کی طرف ضرور مائل ہوگی اور وہ آپ کا بہترین ساتھی بن جائے گا۔

آپ کا کام چاہے کتنا ہی کٹھن ہو، اپنے ملازم کو دوستانہ لہجے میں کہیے اور اس کی ذرا تعریف کیجیے اس سے اس میں جوش پیدا ہوگا اور وہ آپ کا کام لگن اور تن دہی سے کرے گا۔

دوست بننے کا ایک حصہ مسکراہٹ اور خوش مزاجی بھی ہے۔ جب آپ کے چہرے پر مُسکراہٹ ہوگی تو ہر انسان آپ سے مرعوب ہوگا۔ آپ جب بھی کسی سے ملیں تو اُسے دیکھ کر مسکرائیے۔ آپ کی مسکراہٹ سے وہ یہ سمجھے گا کہ آپ اس کی شخصیت کو پسند کرتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں وہ بھی آپ سے ہنس کر بات کرے گا۔ چین میں یہ کہاوت مشہور ہے کہ "فطرت جب مُسکراتی ہے تو پھول کھِل جاتے ہیں۔" ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کا عقیدہ ہے کہ مسکراہٹ زندگی کی نشانی ہے۔ ہم اپنی روزمرّہ کی زندگی پر نظر ڈالتے ہیں تو سمجھ میں آتا ہے کہ درحقیقت لوگوں پر اچھا اثر ڈالنے کی جتنی استعداد اِک

ہلکی سی مُسکراہٹ میں ہے اتنی کشش خوش نُما قیمتی کپڑوں، موتی اور جواہرات کے زیوروں میں بھی نہیں ہوتی۔ بات کرنے والے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھ کر دل خود بخود کھنچنے لگتا ہے، بشرطیکہ یہ بناوٹی نہ ہو۔ اصلی مُسکراہٹ وہی ہے جو دل کو گرما دے مہربان اور ہمدرد دوست زندگی کی عظیم نعمت ہے۔

آیئے! ہم بھی آج سے ایک ایسے مثالی دوست بن جائیں جس پر دنیا بھی رشک کرے۔

فرض شناس سپاہی

محبوب الرحمان عطری، کراچی

نپولین فرانس کا عظیم بادشاہ گزرا ہے۔ اس کے زمانے میں فرانس کو بے شمار فتوحات نصیب ہوئیں اور ملک نے خوب ترقی کی۔ وہ بڑا بہادر اور بیدار مغز جرنیل تھا۔ اس کی کمان میں فرانس کی فوجیں برق رفتاری سے حملہ کر کے دشمنوں کو شکست فاش دیتی تھیں ــــ اِسی نپولین کا ذکر ہے کہ اُس نے اپنی فوجوں کے ذریعے اپنے دُشمن ملک کے شہر رالسبون پر حملہ کیا۔ اس کا حملہ بڑا پُر اعتماد تھا اور اُسے پکا یقین تھا کہ اُس کی فوجیں یہ شہر آسانی سے فتح کر لیں گی، لیکن اس کے برخلاف ابتدا میں فرانسیسی فوجوں کو زک اُٹھانی پڑی۔ جب یہ خبر نپولین کو پہنچی تو وہ مایوس ہو گیا اور میدانِ جنگ سے ایک میل دُور ایک پہاڑی پر مایوسی سے سر جھکائے کھڑا سوچنے لگا کہ اُسے زندگی میں پہلی بار شکست کا سامنا کرنا کرنا پڑے گا۔ اس کے سارے منصوبے ناکام ہو جائیں گے تو پھر عوام کو کس طرح منہ دکھا سکے گا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اس کی فوجوں کا کمانڈر دُشمن کے شہر کی فصیل پر چڑھ جائے تو فتح و نُصرت اس کے قدم چوم لے گی۔ وہ انھیں خیالات میں کھویا ہوا کھڑا تھا کہ ایک سوار تیزی سے اس پہاڑی کے قریب آیا۔

سوار بادشاہ کے قریب آتے ہی آدابِ شاہی بجا لایا۔ وہ بالکل نوجوان اور کم سن تھا۔ اس کے سینے میں گہرا زخم لگا تھا جو غور سے دیکھنے پر محسوس ہوتا تھا۔ گھڑ سوار نوجوان نے خوشی سے بریز لہجے میں کہا "اے عظیم بادشاہ! ہماری فوجوں نے شہر رالسبون فتح کر لیا ہے اور شہر کے قلب میں پہنچ گئی ہیں۔ سب آپ کی آمد کے منتظر ہیں۔ آپ بڑی شان سے شہر میں داخل ہو سکتے ہیں۔" بادشاہ کی آرزو پوری ہو گئی تھی۔ وہ یہ خوش خبری سُن کر بے حد خوش ہوا اور اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی، لیکن اچانک اس کی نظر خوش خبری دینے والے سپاہی کے زخم پر پڑی اس کا دل مُرجھا گیا، کیوں کہ اس کی فوج کا ایک سپاہی اس کے سامنے شدید زخمی تھا، اس کا دل اس پرندے کی طرح تڑپ اٹھا جس کا بچّہ زخمی ہو جاتا ہے۔ بادشاہ نے کہا "لیکن تم تو شدید زخمی ہو۔" سپاہی نے جواب دیا "میں نے اپنا فرض پورا کر دیا ہے۔ اور میں زخمی نہیں ہوں بلکہ مر گیا ہوں۔" یہ کہتے ہی سپاہی بادشاہ کے قدموں میں گر کر مر گیا۔

(ماخوذ)

ہمارے نبیؐ

محمد علی حسن ارشد، کراچی

۱۲ ربیع الاول ہی وہ تاریخی دن ہے جب وہ دو عالم کے سرکار خاتم النبیین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس دُنیا میں تشریف لائے۔ آپؐ ۵۷۰ء میں پیدا ہوئے۔ حضور اکرمؐ کا شجرۂ نسب حضرت ابراہیم علیہ السّلام سے جا ملتا ہے۔ اس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وہ دُعا قبول ہوئی جس میں انھوں نے خدا سے کہا تھا کہ "اے اللہ میری نسل میں سے ایسے نبی کو پیدا کر جو ساری دُنیا کے لیے ہدایت ہو"۔

آپؐ کے والد حضرت عبداللہ کا انتقال

آپؐ کی پیدائش سے پہلے ہی ہو چکا تھا۔ ابھی آپؐ صرف چھ برس کے تھے کہ آپ کی والدہ ماجدہ بی بی آمنہ کا بھی انتقال ہو گیا، کیوں بچپن ہی میں آپ یتیم و یسیر ہو گئے تھے اِس لیے بڑے ہو کر آپؐ کے دِل میں یتیموں کے لیے ہمدردی باقی رہی۔ والدہ کے بعد آپ کی پرورش آپؐ کے دادا حضرت عبدالمطلب نے کی، مگر خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا اور آپؐ کے سر سے دادا کا سایۂ شفقت بھی اُٹھ گیا۔ ان کے بعد آپ کے چچا حضرت ابو طالب نے آپ کی پرورش کی۔ آپؐ کی جوانی نیک کاموں میں گذری۔ آپ نے جوانی میں بہادری کے کھیل مثلاً: گھڑ سواری، نیزہ بازی وغیرہ بھی کھیلے۔ اپنے چچا کے ساتھ رہ کر آپؐ نے تجارت کے پیشے میں ان کا ہاتھ بٹایا۔ اس طرح آپؐ ایک اچھے تاجر بن گئے۔ مکّے کی سب سے مال دار خاتون حضرت خدیجہؓ نے آپ کی ایمان داری اور دیانت کے بارے میں سنا تو آپ کے ذریعے اپنا مال شام بھجوایا اور اپنے ایک ملازم میسرہ کو بھی ساتھ کر دیا۔ جب آپ شام سے واپس لوٹے تو حضرت خدیجہؓ کو اپنی توقع سے زیادہ منافع ہوا۔ حضرت خدیجہؓ بیوہ تھیں۔ جب آپؓ نے حضورؐ کی دیانت و ایمان داری کا حال دیکھا تو بہت متاثر ہوئیں اور شادی کا پیغام بھجوایا۔

حضرت خدیجہؓ سے شادی کے وقت حضور کی عمر ۲۵ برس اور حضرت خدیجہؓ کی عمر ۴۰ سال تھی۔ پاکیزگی اور ایمان داری کا یہ ملاپ نہایت پختہ ثابت ہوا اور حضورؐ نے حضرت خدیجہؓ کی زندگی میں دوسری شادی نہیں کی۔ شادی کے بعد آپؐ خدا کی یاد میں مشغول ہو گئے اور مکّے سے دو ڈھائی میل دُور غارِ حرا کو اپنی عبادت کا مرکز بنا لیا۔ وہاں آپؐ دو دو تین تین دن تک عبادت میں مشغول رہتے۔ اس غار میں ایک دن ۶۱۰ء میں جب آپ کی عمر چالیس برس کی تھی، اللہ کی طرف سے حضرت جبرئیل علیہ السلام وحی لے کر آپؐ کے پاس آئے اور آپؐ آخری نبی بنائے گئے۔ اس موقع پر آپؐ بہت پریشان تھے، مگر حضرت خدیجہؓ نے آپ کو دلاسا اور سہارا دیا اور فرمایا کہ، "آپؐ دنیا والوں کے ساتھ نیکی کرتے ہیں۔ مسکینوں کو کھانا کھلاتے ہیں اور حق کی حمایت

کرتے ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ آپ کو غمگین نہیں کرے گا۔"

حضرت خدیجہؓ نے پورا واقعہ سنا اور دل و جان سے آپؐ پر ایمان لے آئیں۔ بعد میں انجیل و تورات کے عالم ورقہ بن نوفل نے آپؐ کی نبوت کی تصدیق کی۔ دوسری وحی آنے کے بعد خدا کے حکم سے آپؐ نے اعلانِ نبوت کر دیا اور یہ سعادت حضرت خدیجہؓ کو حاصل ہوئی کہ انھوں نے سب سے پہلے اپنی زبان سے کلمہ توحید پڑھا۔ جب آپؐ نے نبوت کا اعلان کیا تو قریش کے لوگوں نے آپؐ کا مذاق اڑایا اور پتھر مارے۔ ظاہر ہے کہ آدمی اپنے باپ دادا کے مذہب کو اتنی آسانی سے نہیں چھوڑتا، مگر کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنھوں نے آپؐ کی باتوں کو غور سے سنا اور آپؐ پر ایمان لے آئے۔

جیسے جیسے مسلمانوں کی تعداد بڑھتی گئی کفارِ مکّہ کے ظلم بھی بڑھنے لگے۔ آخر کار قریش کے مظالم سے تنگ آکر مسلمانوں کی ایک چھوٹی سی جماعت حبشہ ہجرت کر گئی۔ نبوت کے ساتویں سال مسلمانوں کو شعب بن ابی طالب کی گھاٹی میں محصور ہونا پڑا۔

اس واقعہ کے بعد ہی آپؐ کے چچا ابو طالب اور آپؐ کی رفیقۂ حیات حضرت خدیجہؓ انتقال کر گئیں۔ اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد معراجِ نبوی کا واقعہ پیش آیا۔ نبوت کے تیرہویں سال مسلمان مدینہ ہجرت کر گئے۔

مدینے میں حضورؐ نے مسلمانوں کو بھائی چارے کا سبق دیا اور انصار نے مہاجرین کے لیے بڑی بڑی قربانیاں دیں۔ ۱۰ رمضان ۸ ہجری کو فتح مکہ کا واقعہ پیش آیا۔ مکّے کے لوگ ڈر رہے تھے کہ اُن سے سخت بدلہ لیا جائے گا۔ مگر حضورؐ نے چند شرطوں پر عام معافی کا اعلان کر دیا۔ یہ آپ رحم دلی کی اعلا مثال ہے۔

۲۵ ذی قعدہ کو ایک لاکھ چھبیس ہزار مسلمان مکّے کی جانب حج کرنے چلے۔ حج میں آپؐ نے وہ عظیم الشان خطبہ دیا جو حضورؐ کی ساری تعلیمات کا نچوڑ ہے یہ آپؐ کا آخری حج تھا، اس لیے اس کو حجۃ الوداع بھی کہتے ہیں۔ مکّے سے واپس آنے کے بعد آپ کی طبیعت ناساز ہوئی اور آپؐ ۱۲ ربیع الاول ۱۱ ہجری بروز دوشنبہ بہ عمر ۶۳ سال انتقال کر گئے۔ درود و سلام ہو آپؐ پر۔

تمام نونہالوں کو چاہیے کہ وہ سیرت النبیؐ پر عمل کریں، قرآن پڑھیں اور اللہ کے احکام پر عمل کریں۔

کسبِ حلال

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص دنیا میں سوال سے بچنے، اہل پر خرچ کرنے اور پڑوسی پر مہربانی کرنے حلال کی روزی حاصل کرے گا اس کا چہرہ قیامت کے دن چودھویں رات کے چاند کی طرح روشن ہوگا اور وہ اسی حال میں خدا سے ملاقات کرے گا، اور جو شخص کہ حلال روزی فخر کرنے اور دکھانے کے لیے کمائے گا خدا اس پر قیامت کے دن غضب ناک ہوگا۔

دِل چسپ اور حیرت انگیز

ہاتھ ملانے کی رسم قدیم رومیوں کے زمانے میں شروع ہوئی۔ اُن دنوں لوگ تلواریں لے کر گھومتے تھے اور اکثر لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں۔ لہٰذا جب دو آدمی ایک دوسرے سے ملتے تھے تو وہ اپنا داہنا ہاتھ بڑھا دیتے تھے۔ اس طرح سے یہ ظاہر کیا جاتا تھا کہ وہ ایک دوسرے کے خلاف تلوار استعمال نہیں کریں گے۔

مانٹریال (کناڈا) میں ہر سال کناڈین پسفک ریلوے، لاوارث سامان کا نیلام کرتی ہے لیکن صندوق اور سوٹ کیس نیلام سے پہلے نہیں کھولے جاتے۔ لہٰذا خریداروں کو یہ معلوم نہیں ہو پاتا کہ آیا ان صندوقوں کے اندر جو سامان ہے وہ قیمتی ہے یا نہیں۔ ایک عورت نے تین ڈالر دے کر ایک سوٹ خریدا اور خوش قسمتی سے اس سوٹ کیس میں اسے سو ڈالر کی قیمت کے زیورات مل گئے۔

بزمِ نونہال

ماہ فروری کا نونہال پڑھا تو محسوس ہوا کہ اِس رسالے میں اب ہر مہینے پہلے سے بڑھ کر اچھی اور دل نشیں تحریریں چھپ رہی ہیں۔

(محمد اقبال غوری، نواب شاہ)

میرا ایک عظیم شاعر اور عمدہ نثر نگار جو پاکستان کے ایک گوشے میں رہتا ہے، اس مرتبہ جلد ہی بازار میں آگیا۔ اس کی کہانیاں اور لطیفے سب اچھے تھے۔

(شکیل احمد رضی، کراچی)

میں نے نونہال پڑھا تو مجھے مسرت ہوئی۔ یہ رسالہ ہر لحاظ سے معلوماتی ہے۔ اس میں جس چیز کی کمی ہے وہ یہ ہے کہ آپ نے اس میں سوال و جواب کا سلسلہ شروع نہیں کیا۔

(این اے کاظمی، ملتان۔ غلام حسین سومرو، ٹھٹھری کچھی)

ہمدرد نونہال میں سوال و جواب کے دو سلسلے پہلے ہی شائع ہو رہے ہیں ایک "ہمدرد انسائیکلو پیڈیا" جس میں سائنسی اور معلوماتی سوال اور اُن کے جواب ہوتے اور دوسرا "معلوماتِ عامہ" کا سوال نامہ، بعض سوالوں کے جواب "بزمِ نونہال" میں بھی دیے جاتے ہیں۔ (ادارہ)

فروری کا نونہال بہت اچھا تھا۔ حکیم صاحب کا "جاگو جگاتو" پہلے کی طرح مشعلِ راہ ہے۔ چند سوالوں کے جوابات درکار ہیں:۔

(۱) ہمارا نونہال کب سے چلا آرہا رشائع) ہے (۲) نونہال کے پہلے ایڈیٹر کون تھے؟

(محمد سلیم بھٹی، شیخوپورہ)

ہمدرد نونہال ۱۹۵۳ء سے حکیم محمد سعید صاحب کی نگرانی اور مسعود احمد برکاتی کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے۔

جنوری کا رسالہ اپنی پوری آب و تاب سے جب گھر آیا تو شروع ورق پر بطقوں کی تصویر دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔

(ثمر جاوید، کراچی)

ہمیں خوشی ہے کہ آپ نے خط خود لکھا ہے۔ آپ کے خط کی جو عبارت ہم نے یہاں چھاپی ہے اِس میں

آپ نے دو لفظ غلط لکھے ہیں انہیں تلاش کرکے دُرست کر لیجیے۔

● مجھے نونہال پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ جب ایک شمارہ پڑھ لیتا ہوں تو اگلے شمارے کا انتظار رہتا ہے۔

(لال محمد بلوچ، کراچی)

● مجھے تمام رسالوں میں ہمدرد نونہال سب سے زیادہ پسند ہے۔

صوفی نورالٰہی سلامت، لاوہ۔ ظاہر شاہ جگر کوٹ کوہاٹ، کھتری محمد علی شاہین، حیدرآباد۔ محمد لطیف، لاہور

● فروری کے شمارے میں ایک غلطی ہے۔ رسالے میں لفظ "علیحدہ" کو "علاحدہ" لکھا گیا ہے۔

اس لفظ کی صحیح لکھائی "علاحدہ" ہے۔

● اس دفعہ کا نونہال بہت دل چسپ تھا۔ اس کے تمام لطیفے اور کہانیاں دل چسپ تھیں۔

سید محمد رومی، سید محمد عامر ترمذی کراچی۔ عامر خلیل، اوپل گجرات۔ سید شکیل جاوید ہاشمی، کراچی۔ نعیم اختر، نائلہ یاسمین، کراچی۔ نجمہ نور، کراچی۔ نوشابہ فردوس صدیقی، کراچی۔ محمد ادریس احمد، رحیم یارخاں۔ ارشد سعید منٹو، کراچی۔ سید علی وصی زیدی، کراچی۔ اسد اسمٰعیل، کراچی۔ ناظم رضا، کراچی۔ خدیجہ فاروق، ذکیہ فاروق، فہیمہ ناز، کراچی۔ قمر جاوید، کراچی۔ صغرا انجم، کراچی۔ جہتاب اکبر علی، کراچی۔ افتخار احمد، کراچی۔ عبدالخالق غوری، کراچی۔ حیدر علی بلوچ، پسنی، مکران۔

● سارے کا سارا پرچہ بے حد پسند آیا۔ آپ چاہے اس پیارے رسالے کی قیمت پانچ رُپے ہی کیوں نہ کر دیں ہم اپنا رسالہ ضرور خریدیں گے۔

حافظ مظفر محسن، لاہور۔ علی رضا خان، کراچی۔ محمد الیاس، حیدرآباد۔ اعجاز احمد، چارسدہ۔ جمیل الرحمان طاہر، کمان والہ سیال کوٹ۔ عابدہ اختر، لائل پور۔ محمد انیس، رحیم یارخاں۔ عبدالغنی، کراچی۔

● "ہمیں ریڈیو پروگرام کیسے سنائی دیتے ہیں؟" پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا۔

محمد یونس بلوچ، پسنی مکران۔ عابدہ خان، کراچی۔ اعظم جمال، لائل پور۔

● میں عرصۂ دراز سے ہمدرد نونہال کا مسلسل مطالعہ کر رہا ہوں۔ ہر ماہ بچّوں کے بہت سے شمارے میری نگاہوں سے گزرتے ہیں، مگر نونہال سے بہتر کسی کو نہیں پایا۔

خالد منیر منور، ملتان۔ ٹیپو جاوید سلیم، کراچی۔ عابد حسین انجم، کالا گوجراں۔ محمد عباس انجم، حافظ آباد۔

● نونہال تمام رسالوں سے منفرد ہے۔ اس کا سوسائٹی میں اہم مقام ہے۔

(فیض احمد چودھری، لائل پور)

● رُبالو کے کارنامے، ایک لڑکے کا روزنامچہ، کوّے کی عیاری، پتّی اور اس کا دوست اور سیکریٹری برڈ اچھی کہانیاں ہیں۔

سید محمد احمد معصوم، کراچی۔ جاوید اقبال مغل، لاہور۔ نسیم احمد، محمد انیس، عبدالحمید، عبدالقادر، نور محمد، محمد امین، خورشید انور، عمران شاہ، محمد ظفر، محمد صابر، شمیم احمد کراچی

فریدہ مسرور، کراچی۔ صفدر حفیظ، کراچی۔ زاہد سلطان نظامی، شیخ محمد معین، خالدہ سلطانہ، کراچی۔ شیخ محمد افضل خالد، کراچی۔

• اس مہینے کا نونہال میرے گھر والوں اور میرے دوستوں کو بہت پسند آیا۔

عبدالسمیع ہاشمی، کراچی۔ محمد منیر یحییٰ پٹیل کراچی، نازنین پروین ناز، کراچی۔ خالد محمود، راولپنڈی۔ اظفر قیوم غوری، کراچی۔ سید تنویر مہدی رضوی۔ میر ارشد علی خیر پور میرس۔

• بڑی خوشی کی بات ہے آپ نے صفحات کم نہیں کئے۔ (روبینہ ناز، کراچی)

• سرورق خوب صورت تھا، پسند آیا۔

سید خالد فضل، کراچی۔ عبدالغنی بلوچ، کراچی۔ راجا شاہد رزاق، کراچی۔ انور اسٹیفن، کراچی۔ محمد سلمان، کراچی۔ ساجد رزاق، حیدر آباد۔ سید وسیم علی، اسلام آباد۔ زیبا عزیز، حیدر آباد۔ خواجہ ضیاء اللہ، جڑانوالہ۔ محمد شکور، حیدر آباد۔ تنویر یاور بٹ، لاہور

• سرورق کوئی خاص نہ تھا۔

خالد حسن شیخ، کراچی۔ اعجاز الحق، کراچی، شگفتہ فرحت، کراچی۔ محمد ناصر علی، کراچی۔ رئیس احمد رئیس، لائل پور۔ فہیم الدین احمد، راولپنڈی۔ محمد صادق قریشی، حیدر آباد۔

• نونہال ادیب کی تحریریں خوب صورت تھیں (شاہد نور، بہاول پور)

• جب ہم بڑے ہوتے تھے" کا سلسلہ بہت پسند آیا۔ (خورشید الدین، کراچی)

• خیال کے پھول، کا سلسلہ اچھا ہے۔

عاقل بابا نوشاد بلوچ، آب سری۔ اسد اسمٰعیل، کراچی۔ ناظم رضا، کراچی۔

• مجھے "ہمدرد انسائیکلو پیڈیا" خاص طور پر پسند ہے۔ (محمد انور، کراچی)

• مجھے پہلے نمبر پر "جاگو جگاؤ" دوسرے نمبر پر "ہمدرد انسائیکلو پیڈیا" اور تیسرے نمبر پر "خیال کے پھول" پسند ہیں۔ (صلاح الدین احمد، کامران، کراچی)

• آج صبح میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ میرے سرہانے نونہال رکھا ہوا تھا۔ خوشی سے میری چیخ نکل گئی۔ میں نے وہیں لیٹے لیٹے پورا نونہال پڑھ ڈالا۔ (عابدہ فرحین، کراچی)

• خدا رسالے کو نظرِ بد سے بچائے، کیوں کہ دنیا کا دستور ہے کہ جب کوئی رسالہ یا چیز مشہور ہو جاتی ہے تو لوگ حسد کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

عشرت بلقیس، کراچی

• نونہال ادیب بہت دل چسپ ہوتا ہے اس میں بچوں کی معلومات میں اضافہ ہونے کے ساتھ ان میں لکھنے کا شوق بھی پیدا ہوتا ہے۔

عطیہ سیدہ گیلانی، پشاور

معلومات عامہ نمبر ۱۳ کے صحیح جوابات

فروری ۱۹۷۰ء کے ہمدرد نونہال میں معلوماتِ عامہ نمبر ۱۳ کے جو سوالات شائع ہوئے تھے ان کے صحیح جوابات یہ ہیں:

۱۔ صحاح ستہ میں حدیث شریف کی مندرجہ ذیل چھ کتابیں شامل ہیں:۔

۱۔ صحیح بخاری ۲۔ صحیح مسلم ۳۔ سُنن ابو داؤد

۴۔ ترمذی ۵۔ نسائی ۶۔ ابنِ ماجہ

۲۔ پاکستان کے مشہور ادیب چراغ حسن حسرت مرحوم مزاحیہ مضامین میں اپنا نام "سندباد جہازی" لکھا کرتے تھے۔

۳۔ ادارہ "دارالمصنفین" اعظم گڑھ کی بنیاد ممتاز عالم علامہ شبلی نعمانی مرحوم نے رکھی تھی۔

۴۔ جب سورج اور چاند کے درمیان زمین آجاتی ہے تو چاند گرہن واقع ہوتا ہے۔

۵۔ جس طرح انگلینڈ کا شہر شیفیلڈ چاقو اور چھری کی صنعت کے لیے مشہور ہے۔ اسی طرح پاکستان میں وزیرآباد بھی انھی چیزوں کے لیے مشہور ہے۔

۶۔ تانبے اور جست کے مُرکب کو پیتل کہتے ہیں۔

۷۔ رازی نام کی دو مشہور مُسلمان شخصیتیں گزری ہیں۔ ایک کا نام ابوبکر محمد بن زکریا رازی (حکیم) اور دوسری شخصیت کا نام امام فخرالدین رازی (مفسّر) تھے۔

۸۔ حضرت خدیجہؓ کو اُمّ المومنین خدیجۃ الکبریٰ کہتے ہیں اور حضرت فاطمہؓ کو سیدہ فاطمۃ الزّہراء اور بتول کہا جاتا ہے۔

۹۔ مشہور تفریح گاہ "ہائیڈ پارک" برطانیہ کے مشہور شہر لندن میں واقع ہے جہاں ایک مصنوعی جھیل بھی ہے۔

۱۰۔ اسمٰعیلیہ فرقے کے ۴۸ ویں امام سر آغا خان سوم "اسوان" (مصر) میں دفن ہیں۔

صحیح جوابات بھیجنے والوں کے نام

کراچی

محمد جعفر ابراہیم
زاہد سلطان نظامی
عارف رحیم ساکری
محمد رفیع
امجد آصف علی
سید علی الدین احمد
جاوید سلیم اسمٰعیل

نسرین ناز غوری
آصف علی اشرف علی
اے رحیم
زاہد ظفر زیدی
محمد علی قریشی
ملک نشین
راجا طاہر اکرام

حیدرآباد

اعجاز جنیدی
فرح اقبال ارائیں
رفیع احمد ہاشمی
عبدالنعیم خان
راشد رزاق
جاوید اقبال
شاہد زیب

عبدالوحید عبدالستار

دوسرے مقامات

ندیم احمد — راولپنڈی
محمد ادریس — رحیم یار خاں

صحیح جوابات بھیجنے والوں کی تصویریں

بشیر احمد وارثی، حیدرآباد

محمد اسلم اسمٰعیل، کراچی

شاہد رزاق راجا، کراچی

سید اظہار احمد زیدی، کراچی

شیخ وسیم گل، شکارپور

اسد ایوب، کراچی

اظفر قیوم خان غوری، کراچی

میاں محمد سہیل، کراچی

محمد شہزاد کیرانوی، کراچی | ڈیرا اقبال، کراچی | انور محمود انصاری، کراچی | فرید الدین احمد قریشی، کراچی

محمد رفیق عبدالکریم، کراچی | خواجہ الطاف احمد وہرہ سکھر | افضل کامران، حیدرآباد | ندیم اختر۔ وحدت کالونی

حنیف خان غوری، کراچی | عبداللطیف عثمانی، کراچی | عبدالستار لغاری، سانگھڑ | محمد حنیف لاکھانی۔ کراچی

عرفان احمد ڈہر، سانگھڑ | سیّد انوار احمد زبیری۔ کراچی | محمد عارف مغل، لاہور | محمد اصغر صدیق، کراچی

قاسم علی قاسمی، کراچی | محمد حنیف، کراچی | ساجد رزاق، حیدرآباد | محمد ناصر میر۔ نواب شاہ

سید اظہر حسین زیدی، کراچی

سلیم جمیل، کراچی

ملک ریاض احمد مانسری، کراچی

اقبال عطا، لطیف آباد

جیلانی یوسف، کراچی

عصمت کمال، کراچی

رفیق احمد صدیقی، لطیف آباد

یعقوب حاجی یوسف، کراچی

ایک غلط جواب بھیجنے والوں کے نام

کراچی

محمد منیر یعقوب
نوشابہ فردوس صدیقی
محمد احمد
محمد اویس خاں شاداب
راشد چشتی
محمد جاوید سلیم
اسد اسماعیل
افتخار علی خاں لودھی
محمد رفیق قاسم
ثمینہ جمیل
شبانہ قمر خواجہ
احمد شہیب شبلی
محمد ارشد سلیم
نجم احسن صدیقی
شہزاد معصم
محمد سلیمان خاں یوسف زئی
سید شہزاد علی
رفیع احمد رفیع
صلاح الدین احمد کامران
ادریس آدم غازی
راجا عبداللطیف بٹ
سراج احمد
آنسہ نجمہ انصاری

جیکب آباد

سید عالی مقام جعفری
قریشی خالد ارشاد تبسم
نصیر احمد شیخ
مسرور رضا خاں پٹھان
عبدالمجید چوہان

میرپور خاص

محمد نعیم ملک
نکہت یاسمین
تاج محمد
محمد یوسف خان
خاور بیگ خاور

محمد عبداللہ خان
کریم النساء انجم
فرحت حسین
محمد سلیم ملک
جاوید
لیاقت راہی
سید ضامن عباس جعفری
محمد عبدالخالق خاں
محمد عبدالقادر خاں

حیدرآباد

محمد امتیاز بیگ
محمد اقبال حسین قریشی۔

سید حسن خواجہ
ثروت نسیم
شیخ عبدالقادر جلیل

سکھر

محمد ادریس میمن
جاوید خورشید
ندیم الدین
سلیم خورشید
امین الدین

شکارپور

غلام ظفر سومرو

شفیق اللہ
ایم فاروق ناز
محمد اسلم خان
ایم قاسم محمود
محمد یوسف علی خان
ایم سرفراز
محمد اشرف سلیمی ارائیں
عبیدالرحمان راج پوت
آغا سہیل رعنا
محمد ایوب میمن

دوسرے مقامات

عرفان کریم جسکانی	ڈیرہ غازی خان
قمر عالم قریشی	شہدادپور
سید مظہر علی	شہدادپور
محمد اقبال غوری	نواب شاہ
عبدالحئی ایس دل	گوٹھ ڈینگاڑو
اعظم جمال عبدالمجید	لائل پور
چوہدری محمد حسین	لائل پور
دل امداد علی راہی	امروٹ شریف

نونہال ادیب میں مضامین بھیجنے والوں کے لیے ضروری ہدایات

ہمدرد نونہال کے لیے نونہال جو مضامین خود کوشش کر کے لکھتے ہیں وہ اشاعت کے لیے منتخب کر لیے جاتے ہیں، مگر بعض نونہال رسالوں، اخباروں اور کتابوں سے نقل کر کے اپنے نام سے مضمون بھیج دیتے ہیں۔ یہ بری عادت ہے۔ آپ کو خود کوشش کر کے اپنے دماغ سے سوچ کر لکھنا چاہیے، تاکہ آپ مستقبل کے بہترین ادیب بن سکیں اور آپ پر مضمون کی چوری کا الزام نہ لگے۔ مضامین وغیرہ بھیجنے سے پہلے ان باتوں کا ضرور خیال رکھیے:

★ ایک کاغذ پر ایک سے زیادہ چیز نہ لکھیے۔ لکھنے کے لیے کاغذ کے چھوٹے چھوٹے پرزے استعمال نہ کیجیے۔

★ اکثر مضمون نگار نونہال ہمیں لکھتے ہیں کہ انھوں نے کہانی یا مضمون بھیجا ہے اور وہ شائع نہیں ہوا۔ ایسے تمام نونہالوں کے لیے تحریر ہے کہ وہ کہانیاں اور مضمون جو شائع ہونے کے قابل ہوتے ہیں ہم ترتیب وار شائع کرتے ہیں۔

★ مضمونوں اور کہانیوں کی بھرمار نہ کیجیے۔ اچھے مضمون لکھنے کی کوشش کیجیے۔ مختصر، صاف اور دلچسپ لکھنے کی کوشش کیجیے۔ زیادہ مضمون بھیجنے کے بجائے مضمون کو اچھا بنانے پر توجہ اور وقت صرف کیجیے۔ اچھے مضمون سے بہت جلد شہرت ہوتی ہے۔

حلقۂ دوستی

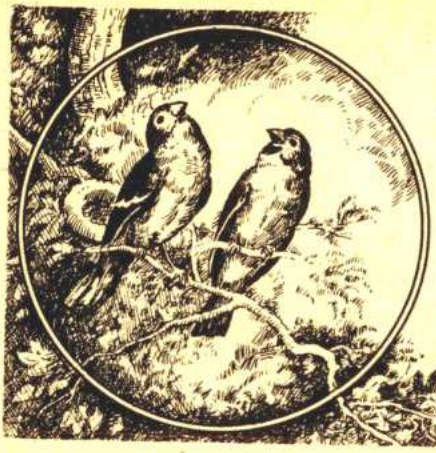

سلیم الرحمان

عمر: ۱۲ تعلیم: ہفتم

دل چسپیاں: قلمی دوستی۔ کرکٹ کھیلنا۔ خط کا جواب جلد دینا

پتا: ۴/۶۳ اے۔ لیاقت آباد، کراچی نمبر ۱۹

آفتاب احمد خان

عمر: ۱۲ سال تعلیم: ہفتم

دل چسپیاں: قلمی دوستی، نونہال پڑھنا، معلومات عامّہ۔

پتا: ۲/۵۴ کمرشیل ایریا، ڈرگ کالونی نمبر ۲۔ کراچی

ملک محمد انور آزاد

عمر: ۱۶ سال تعلیم: میٹرک

دل چسپیاں: قلمی دوستی کرنا، ٹکٹیں اور تصاویر جمع کرنا

پتا: ڈی/۲۲۵۶۔ شہید چوک۔ غلام محمد آباد کالونی۔ لائل پور

احمد شعیب شبلی نعمانی

عمر: ۱۲ سال تعلیم: ہشتم

دل چسپیاں: ٹکٹ جمع کرنا، نونہال پڑھنا۔

پتا: ۴۱/۴۔ ماڈل کالونی، کراچی ۲۷

عبدالسبحان

عمر: ۱۴ سال تعلیم: ہشتم

دل چسپیاں: نونہال اور کہانیاں پڑھنا، ہاکی کھیلنا۔

پتا: چک ایس۔ پی/۳ ڈاک خانہ بیل گنج تحصیل بہاول پور، ضلع ساہیوال

محمد کامران

عمر: ۱۱ سال تعلیم: ششم

دل چسپیاں: ٹکٹ جمع کرنا، سائیکل چلانا

پتا: ۱۰۰ عثمانیہ کالونی۔ ناظم آباد۔ کراچی ۱۸

انیس الرّحمان

عمر: ۱۳ سال — تعلیم: نہم

دل چسپیاں: ہاکی کھیلنا، ٹکٹ جمع کرنا

پتا: ۴/۶۳ لیاقت آباد، کراچی

سعد اختر

عمر: ۹ سال — تعلیم: چہارم

دل چسپیاں: قلمی دوستی، ہاکی کھیلنا، فٹ بال کھیلنا۔

پتا: ۹۰ سی۔ بلاک آئی۔ نارتھ ناظم آباد، کراچی

اُسامہ اختر

عمر: ۱۳ سال — تعلیم: ہفتم

دل چسپیاں: ہاکی کھیلنا، فٹ بال کھیلنا، قلمی دوستی کرنا۔

پتا: سی/۹۰۔ بلاک آئی نا، نارتھ ناظم آباد۔ کراچی

محمد یعقوب، محمد منیر

عمر: ۱۲ سال — تعلیم: ششم

دل چسپیاں: معلومات جمع کرنا، نونہال پڑھنا، ہاکی کھیلنا۔

پتا: تیسری منزل، حاجی ولی محمد بلڈنگ کھارادر۔ کراچی ۲

اقبال حسین

عمر: ۱۶ سال — تعلیم: فرسٹ ایر

دل چسپیاں: ٹکٹوں کا تبادلہ کرنا۔

پتا: ۱۳ مدینہ منزل، نشتر روڈ۔ کے ایم سی پرنٹنگ پریس۔ کراچی

اختر حسین شیوانی

عمر: ۱۲ سال — تعلیم: ہفتم

دل چسپیاں: کرکٹ کھیلنا، نونہال پڑھنا، ٹکٹ جمع کرنا۔

پتا: گورنمنٹ ہائی اسکول، گوادر

سیّد اعجاز عزیز

عمر: ۱۳ سال — تعلیم: ہشتم

دل چسپیاں: کرکٹ کھیلنا، نونہال پڑھنا

پتا: سید آفتاب حسین، میونسپل کارپوریشن، سنٹری انسپکٹر ٹنڈو الہ یار

ریحان احمد جلالی

عمر: ۱۳ سال — تعلیم: ہفتم

دل چسپیاں: ٹکٹ جمع و تبادلہ کرنا، قلمی دوستی اور نونہال پڑھنا۔

پتا: ۱۲۱۷/۱۴ دستگیر سوسائٹی، ایوب منزل، فیڈرل بی ایریا، کراچی

مُبین الحق

عمر: ۱۲ سال — تعلیم: ہشتم

دل چسپیاں: ٹکٹوں کا تبادلہ کرنا، قلمی دوستی کرنا۔

پتا: ۱۳/این/۱۶۰، پی۔ ای سی۔ ایچ۔ ایس سوسائٹی، کراچی

محمد عمران

عمر: ۱۴ سال — تعلیم: میٹرک

دل چسپیاں: ٹکٹ اور پرانے سکّے جمع کرنا۔

پتا: جے ۳۶۹ اے، نارتھ ناظم آباد، کراچی

احمد رسُول

عمر: ۱۶ سال — تعلیم: ہشتم

دل چسپیاں: ٹکٹ جمع کرنا، مطالعہ کرنا، فٹ بال کھیلنا۔

پتا: ڈبلیو، ڈی/۲۶ بی، ایریا لیاقت آباد، کراچی

محمّد عبداللہ حسین

عمر: ۱۰ سال — تعلیم: چہارم

دل چسپیاں: ہاکی کھیلنا، نونہال پڑھنا

پتا: مکان نمبر ۳/۱۹۵، لیاقت آباد۔ کراچی نمبر ۱۹

محمد ظفر اختر

عمر: ۱۶ سال تعلیم: نہم

دل چسپیاں: قلمی دوستی، ہاکی کھیلنا، نونہال پڑھنا، معلومات عامہ

پتا: مکان نمبر ۴، یونٹ نمبر ۸ بلاک نمبر بی اکبری مسجد، لطیف آباد حیدرآباد

نسیم شاہین

عمر: ۱۵ سال تعلیم: میٹرک

دل چسپیاں: قلمی دوستی کرنا۔

پتا: ۱/۲۲۱-۳ آزاد میدان، ہیرآباد، حیدرآباد، سندھ

عبداللہ

عمر: ۱۶ سال تعلیم: دہم

دل چسپیاں: نونہال پڑھنا، ٹکٹ جمع کرنا، قلمی دوستی کرنا۔

پتا: ۱/۱۰-اے، سلطان آباد، گولیمار نمبر ۱، کراچی نمبر ۱۸

محمد فہیم

عمر: ۱۳ سال تعلیم: ہفتم

دل چسپیاں: قلمی دوستی کرنا، کہانیاں پڑھنا۔

پتا: مکان نمبر ۱۲۴۰/۷-اے، شاہی بازار، پرانا سکھر

انیس احمد

عمر: ۱۲ سال تعلیم: ہشتم

دل چسپیاں: ٹکٹ جمع کرنا، قلمی دوستی کرنا، مطالعہ کرنا۔

پتا: ۵/۴ ڈی ناظم آباد نمبر ۲، کراچی نمبر ۱۸

سیّد مظہر علی

عمر: ۱۵ سال تعلیم: نہم

دل چسپیاں: نونہال پڑھنا، قلمی دوستی کرنا، ہاکی کھیلنا

پتا: معرفت، حکیم سید اظہر علی، شاہی بازار، شہداد پور

صلاح الدین

عمر: ۱۵ سال تعلیم: نہم

دل چسپیاں: ویو کارڈ، ٹکٹیں، سکّے جمع کرنا اور تبادلہ کرنا۔

پتا: محمدی بازار، لاڑکانہ، سندھ

افتخار حسین (ایس)

عمر: ۱۶ سال تعلیم: ایف اے

دل چسپیاں: قلمی دوستی، ٹکٹیں جمع کرنا، مطالعہ اور فوٹو گرافی

پتا: مکان نمبر ۱۰۷-اے پی، گلی نمبر ۳ دھوبی گھاٹ، لائل پور

راحیل انور

عمر: ۱۲ سال تعلیم: ہشتم

دل چسپیاں: قلمی دوستی، ٹکٹ جمع کرنا، نونہال پڑھنا، ہاکی کھیلنا۔

پتا: ۱۰۰/۱۷-اے رحیم آباد، فیڈرل بی ایریا، گلبرگ، کراچی ۳۸

عامر رحمان خان

عمر: ۱۱ سال تعلیم: ہفتم

دل چسپیاں: کرکٹ کھیلنا، ٹکٹ اور سکّے جمع کرنا۔

پتا: معرفت: احمد رحمانی، ڈی سی ۳۵ بلاک ایف۔ نارتھ ناظم آباد۔ کراچی

محمد افضل سعید

عمر: ۱۳ سال تعلیم: ہشتم

دل چسپیاں: نونہال پڑھنا، کرکٹ کھیلنا، ٹکٹ جمع کرنا۔

پتا: سنٹرل جنرل اسٹور، چوک بازار، بھاول پور

غلام سرور گوجرانہ

عمر: ۱۲ سال تعلیم: ششم

دل چسپیاں: فٹ بال کھیلنا، قلمی دوستی کرنا

معرفت ماسٹر عبداللہ اینڈ محمد عیسٰی دکان دار، تربت

قمر عالم

عمر: ۱۴ سال — تعلیم: نہم

دل چسپیاں: ٹکٹ جمع کرنا، قلمی دوستی کرنا

پتا: حافظ امام الدین، پاکستان فلور مل، شہداد پور

سید نوید عباس

عمر: ۱۲ سال — تعلیم: ہشتم

دل چسپیاں: ٹکٹ جمع کرنا، نونہال پڑھنا

پتا: ۲۰/۶۹۵، فیڈرل بی ایریا، کراچی

محمد جاوید

عمر: ۱۳ سال — تعلیم: ہفتم

دل چسپیاں: کرکٹ اور ہاکی کھیلنا، ٹکٹ جمع کرنا اور تبادلہ کرنا۔

پتا: این۔ پی ۳ ۴م/۱۲ محمد شاہ اسٹریٹ، صرافہ بازار، کراچی

دانش عزیز شمسی

عمر: ۱۵ سال — تعلیم: میٹرک

دل چسپیاں: ڈرائینگ کرنا، قلمی دوستی اور ٹکٹ جمع کرنا۔

پتا: شمسی آٹو سینٹر، اسٹیشن روڈ، لاڑکانہ

صفدر اقبال

عمر: ۱۱ سال — تعلیم: ششم

دل چسپیاں: ٹکٹ جمع کرنا، ہاکی کھیلنا۔

پتا: فیض منزل، محلہ بٹڑا، خیر پور میرس

سید نجیب احمد

عمر: ۱۴ سال — تعلیم: نہم

دل چسپیاں: ٹکٹ جمع کرنا اور تبادلہ کرنا، کرکٹ کھیلنا۔

پتا: ۲/۴، ، بہار کالونی مسان روڈ۔ کراچی

مجیب الرحمٰن ارشد

عمر: ۱۳ سال — تعلیم: میٹرک

دل چسپیاں: سکے، ٹکٹ، ماچس اور پنسلیں جمع کرنا۔

پتا: ۸۳۔ شرف آباد، کراچی ۵

حسن رشید

عمر: ۱۰ سال — تعلیم: چوتھی

دل چسپیاں: ٹکٹ جمع کرنا اور کہانیاں پڑھنا

پتا: ۲۷/اے حسین ڈی سلوا ٹاؤن، بلاک بی۔ کراچی

عبدالرزّاق راہی

عمر: ۱۱ سال — تعلیم: چہارم

دل چسپیاں: قلمی دوستی، کبڈی کھیلنا، خطوں کا جواب دینا۔

پتا: گورنمنٹ مڈل اسکول، عیسیٰ خیل، ضلع میانوالی، پنجاب۔

مرزا ساجد حسین

عمر: ۱۶ سال — تعلیم: انٹر

دل چسپیاں: قلمی دوستی کرنا، مطالعہ کرنا

پتا: مکان نمبر ۵۹ بیر کالونی، کراچی نمبر ۵

مرزا ساجد حسین

عمر: ۱۶ سال — تعلیم: انٹر

دل چسپیاں: قلمی دوستی، ٹکٹ جمع کرنا، مطالعہ کرنا۔

پتا: مکان نمبر ۴۔۵۰۔۳۶سی، کورنگی ۵، کراچی

محمد کلیم احمد خان

عمر: ۱۵ سال — تعلیم: میٹرک

دل چسپیاں: کرکٹ کھیلنا، مطالعہ کرنا، ایتھلیٹک ورزش کرنا۔

پتا: ۸/۱۰۷۔ کینٹ بازار، ڈرگ روڈ کراچی نمبر ۸

حکیم محمد سعید پبلشر نے زین پیکجنگ انڈسٹریز کراچی میں چھپوا کر ادارہ مطبوعات ہمدرد ناظم آباد کراچی نمبر ۱۸ سے شائع کیا۔

گرمیوں کے
تند و تیز
ناخوش گوار
دِن...
لیکن یہی دن سیر و تفریح اور کھلی جگہوں پر ہواخوری
سے لطف اندوز ہونے کے بھی ہیں بشرطیکہ لُو اور تپش آڑے نہ آئیں۔
سورج کی تمازت سے جسم پسینے سے شرابور، طبیعت نڈھال اور جی بے قرار
رہتا ہے اور یوں ساری سیر و تفریح کا مزا جاتا رہتا ہے۔ گرمی کے
ان تمام مُضر اثرات کو رُوح افزا کے استعمال سے زائل کیا جا سکتا ہے۔
رُوح افزا جسم و جان کو ٹھنڈک پہنچا کر پیاس کو بجھاتا ہے، طبیعت میں
فرحت، تازگی اور توانائی پیدا کرتا ہے اور سخت حبس کے باوجود آپ کو تازہ دم
رکھتا ہے۔ رُوح افزا کا ذائقہ اور تاثیر دونوں اپنی جگہ لاجواب اور لاثانی ہیں
رُوح افزا مشروبِ مشرق
ہمدرد
SHARBAT
ROOH AFZA

اپریل ۱۹۷۷ عیسوی
ہمدرد نونہال
رجسٹرڈ ایس نمبر ۱۹۰۳